کلیاتِ مجید امجد

طبعِ نو

روزِ رفتہ

ترتیب، تدوین و تحقیق

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

روزِ رفتہ

مجید امجد

روزِ رفتہ

مجید امجد (سوانحی خاکہ)

مجید امجد ۲۹ جون ۱۹۱۴ء کو جھنگ صدر (مگھیانہ) میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک غریب اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابھی وہ دو برس کے تھے جب ان کی والدہ اپنے شوہر سے الگ ہو کر میکے آ گئیں۔ امجد نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا سے حاصل کی جن کا شمار جھنگ کے صوفیا میں ہوتا تھا۔ گھر سے ملحقہ مسجد میں انہوں نے چند سال قرآن' اسلامیات' فارسی' عربی اور طب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۳۰ء میں میٹرک اور ۱۹۳۲ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیے اور ۱۹۳۴ء میں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔

اُس زمانے میں دنیا عظیم اقتصادی بحران کا شکار تھی اس لئے ملازمتیں مفقود تھیں۔ مجید امجد جھنگ میں ایک مقامی ہفت روزہ اخبار ''عروج'' سے بطور مدیر وابستہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ کلرک کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ۱۹۴۴ء میں دوسری عالمی جنگ کے دوران حکومت نے سول سپلائز ڈیپارٹمنٹ قائم کیا۔ مجید امجد ٹیسٹ اور انٹرویو کے بعد منتخب ہوئے اور اسسٹنٹ انسپکٹر سول سپلائز کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد ازاں یہ محکمہ فوڈ ڈیپارٹمنٹ کا حصہ بن گیا۔ مجید امجد آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر بن گئے۔ انہوں نے بے شمار چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں کام کیا لیکن ملازمت کا زیادہ عرصہ منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں بسر ہوا۔ جہاں سے وہ ۲۸ جون ۱۹۷۲ء کو انتیس سال ملازمت کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

مجید امجد کی شادی ان کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ بیوی سے ان کے تعلقات عمر بھر "خنک" رہے۔ بیوی جھنگ کے ایک سکول میں پڑھاتی تھی امجد دوسرے مقامات پر ملازمت کرتے تھے اور شاذ و نادر ہی جھنگ جاتے تھے۔

امجد بڑے وسیع المطالعہ تھے بالخصوص فارسی اور انگریزی شاعری پر انہیں عبور حاصل تھا۔ سائنسی علوم کے مطالعے سے بھی شغف تھا۔ بہت کم گو شرمیلے اور تنہائی پسند تھے۔ اپنی ذات اور شاعری کے بارے میں قطعاً گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حقیقی معنوں میں ان کا کوئی دوست نہیں تھا۔ وہ ملنے جلنے والوں سے "ذاتی معاملات" پر بھی گفتگو نہیں کرتے تھے۔ انتہائی دیانت دار اور خوددار تھے۔

جوانی میں امجد خوش شکل تھے لیکن رفتہ رفتہ بیمار رہنے لگے اور بہت دبلے پتلے ہو گئے تھے۔ لمبا قد تھا اس لئے دبلاپے نے حسن صورت میں کمی کر دی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن بہت دیر سے ملی اس لئے نوبت فاقہ کشی تک جا پہنچی تھی۔ اسی عالم میں ۱۱ مئی ۷۴ء کو اپنے کوارٹر واقع فرید ٹاؤن ساہیوال میں مردہ پائے گئے۔ تدفین اگلے روز جھنگ میں ہوئی۔ ان کی لوح مزار پر انہی کا یہ شعر کندہ ہے۔

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

شب رفتہ

مجید امجد کی زندگی میں ان کا ایک ہی مجموعہ "شب رفتہ" کے نام سے ۱۹۵۸ء میں نیا ادارہ لاہور کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کو ترتیب دیتے ہوئے امجد نے اپنا ابتدائی کلام یکسر خارج کر دیا تھا۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء کے درمیان ان کی اکا دکا نظمیں شائع ہونے لگی تھیں لیکن یہ شاعری انہوں نے شب رفتہ میں شامل نہیں کی۔ میرے نزدیک ان کا یہ فیصلہ بالکل درست تھا۔ ان کی نظم "حسن" ۱۹۳۵ء میں جوش ملیح آبادی کے رسالے "کلیم" میں شائع ہوئی تھی۔ شب رفتہ کا آغاز انہوں نے اس نظم سے کرنا مناسب خیال کیا۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۸ء تک ان کا بہت سا کلام ادبی رسائل و جرائد میں باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ لیکن اسی سال جب شب رفتہ ترتیب دی گئی تو اس میں سے ایک کڑا انتخاب اس میں شامل کیا گیا۔ شب رفتہ میں شمولیت سے محروم رہ جانے والی بعض نظمیں بہت عمدہ ہیں مگر چونکہ "شب رفتہ" مجید امجد کی زندگی میں شائع ہونے والا ان کا واحد مجموعہ ہے اس لئے اس کی الگ شناخت برقرار رکھی گئی ہے۔ امجد نے شب رفتہ کو سنین تخلیق کے مطابق مرتب نہیں کیا تھا لیکن میں نے اس مجموعے کی تمام نظموں کو سختی سے سنین کے مطابق ترتیب دیا ہے۔ زیر نظر کلیات کے اس حصے میں وہ تمام نظمیں شامل ہیں جو ۱۹۵۸ء میں طبع ہونے والی "شب رفتہ" میں موجود تھیں لیکن اب "تاریخ وار" ترتیب پانے کی وجہ سے کسی قدر آگے پیچھے ہوگئی ہیں۔

روزِ رفتہ

مجید امجد نے جو کلام "شب رفتہ" میں کسی بھی وجہ سے شریک نہیں کیا تھا اُسے اس حصے میں شامل کیا گیا ہے۔ ان میں وہ شاعری بھی ہے جو انہوں نے زمانہ طالب علمی میں کی تھی۔ اور وہ کلام بھی ہے جو شب رفتہ میں شمولیت کا مستحق تو تھا مگر کئی وجوہ کی بنا پر شامل نہیں کیا گیا تھا۔ بعض جگہ یہ فیصلہ کرنا سہل نہیں کہ دونوں میں حد فاصل کس طرح قائم کی جائے اس لئے انہیں یکجا رکھا گیا ہے۔ گویا اس حصے میں ان کی ابتدائی اور زمانہ طالب علمی کی شاعری بھی شامل ہے اور شب رفتہ کے دور کی عمدہ شاعری بھی موجود ہے مگر چونکہ یہ

سارا کلام ان کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے اس لئے کلیات میں اس کی شمولیت کا کافی جواز موجود ہے۔ اس حصے کو "باقیات" کا عنوان دے کر کلیات کے آخر میں اس لئے جگہ نہیں دی گئی کہ مجید امجد ان میں سے کئی نظمیں اپنے مجموعہ کلام میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ بعض نہایت اہم نظموں کو بالکل آخر میں لگا دیا جاتا تو ان تک رسائی مشکل ہو جاتی اور ان کے نظر انداز ہونے کا خدشہ پیدا ہو جاتا (موجودہ اشاعت میں اس حصے میں بعض نظموں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے)

امروز

شب رفتہ کے بعد اگرچہ مجید امجد کا کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں نہیں چھپا لیکن انہوں نے ایک ملاقات میں (جو ۱۹۷۲ء میں ہوئی) مجھے یہ بتایا تھا کہ شب رفتہ کے بعد انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے دو مختلف مزاج ہیں اس لئے اس کے دو الگ الگ مجموعے شائع ہونے چاہئیں۔ ایک مجموعہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک کے کلام پر مشتمل ہو اور دوسرے میں ۱۹۶۸ء اور اس کے بعد کی تخلیقات شامل ہوں لیکن "مجید امجد اشاعتی کمیٹی ۔۔ لاہور" نے "شب رفتہ کے بعد" کے زیر عنوان جو مجموعہ ترتیب دیا اس میں شب رفتہ کے دور کے کچھ کلام کا انتخاب اور اس کی اشاعت کے بعد کی ہوئی نظمیں یکجا کر دیں۔ اگرچہ یہ ترتیب مجید امجد کی منشا کے مطابق نہیں تھی تاہم غنیمت تھی۔ مشکل یہ آ پڑی کہ اس میں اغلاط کی بھرمار تھی۔ میں نے بڑی محنت سے اس کا اغلاط نامہ تیار کیا تھا مگر یہ کتاب یوں غائب ہوئی کہ بعد میں کہیں نظر نہیں آئی۔ کلیات کی ترتیب نو میں مجید امجد کی خواہش کے مطابق ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء کا کلام "امروز" کے نام سے اس حصے میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کی بیشتر نمائندہ نظمیں اس میں موجود ہیں۔

فردا

۱۹۶۸ء میں مجید امجد "مفعلن فعلن" کے آہنگ سے مکمل طور پر مسحور ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے یہ واردات میر تقی میر پر بھی گزری تھی جنہوں نے اس بحر میں دو تین سو غزلیں لکھ ڈالی تھیں۔ میر کے بعد یہ بحر امجد کے مزاج کو راس آئی۔ چنانچہ وہ چھ سات سال تک

تمام نظمیں اسی بحر میں لکھتے چلے گئے۔ ان نظموں کے بارے میں عام قاری کی رائے ہے کہ یہ ان کی کمزور نظمیں ہیں جبکہ بعض سنجیدہ قارئین اور وسیع المطالعہ ناقدین کے خیال میں یہ ان کی بہترین تخلیقات ہیں۔ بہر حال یہ مستقبل کی نظمیں ہیں اور ان کی حیثیت کا تعین آنے والا زمانہ کرے گا۔

مذکورہ بالا چاروں حصوں میں سے ''شب رفتہ'' اور ''روز رفتہ'' قریب قریب ایک ہی زمانی وقفے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ۱۹۴۲ء تا ۱۹۵۸ء کے دوران تخلیق ہوئے ہیں۔ انھیں الگ کرنے کا جواز وہی ہے جو سطور بالا میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ''امروز'' اور ''فردا'' میں وہ کلام ترتیب دیا گیا ہے جو ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۴ء کے درمیان صفحہ قرطاس پر منتقل ہوا ہے اور چونکہ وہ مختلف طرز اور اسلوب رکھتا ہے اس لئے دو الگ الگ حصوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ''شب رفتہ'' مجید امجد کا اپنا رکھا ہوا نام ہے جبکہ ''روز رفتہ''، ''امروز'' اور ''فردا'' کے عنوانات مرتب نے قائم کیے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لیے تمام کلام پر سنین تخلیق درج کر دیے گئے ہیں۔

کلیات مجید امجد کی اشاعت اول کے وقت اس کے ناشر اور معروف شاعر جناب خالد شریف نے ''عرض ناشر'' کے زیر عنوان میرے اس کام کو ذیل کے الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا تھا:

> ''تین سال قبل جب میں نے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب سے مجید امجد کے کلام کی ترتیب و تدوین کی درخواست کی تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس کام کو اس قدر سنجیدگی سے لیں گے۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ خواجہ صاحب کے پاس مجید امجد کا کچھ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ پھر یاد دہانیوں، تقاضوں اور ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ جو چلا تو معلوم ہوا کہ مجید امجد کا سارا مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام خواجہ صاحب کو حفظ ہے۔ مسودے کی تیاری، کتابت شدہ مواد کی پروف ریڈنگ اور بعد کے مراحل میں انہوں نے جس باریک بینی اور عرق ریزی سے کام لیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی اس توجہ کے باعث ہم میں سے

چند دوست یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ خواجہ صاحب کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تو درحقیقت اس کام پر ملنی چاہیے تھی"۔

ان کے یہ جملے میرے لیے اعزاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر میری محنت، تحقیق اور عرق ریزی اعزازی ہی رہی۔

اس موقع پر مناسب ہوگا کہ میں نے مجید امجد کے کلام کو جمع کرنے اور ترتیب دینے میں جو محنت اور جستجو کی اس کا ایک سرسری حال بیان کردوں۔

۱۹۷۲ء میں میں نے مجید امجد کا ایک انٹرویو ساہیوال میں ان کے مکان پر ریکارڈ کیا تھا۔ اس وقت میں نے انھیں کسی اچھے ناشر سے ایک یا دو مجموعے شائع کروانے کی پیشکش کی۔ وہ راضی ہو گئے اور وعدہ کیا کہ وہ دو مجموعوں کو حتمی شکل دے سکیں گے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ایک مجموعہ شب رفتہ کے بعد سے ۱۹۶۸ء تک کے کلام پر مشتمل ہو اور دوسرا مجموعہ "فعلن فعلن" والی بحر میں کہی گئی نظموں سے ترتیب پائے۔ ان دنوں مجید امجد کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ میں نے احتیاطاً موٹی موٹی کاپیاں خریدیں اور ان میں ان کا تمام کلام مختلف ذرائع سے حاصل کر کے لکھنا شروع کر دیا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو یہ کاپیاں بھر چکی تھیں۔ اس دوران میری ملاقات کسری منہاس (اب مرحوم) سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ ان سے میرے نیازمندانہ مراسم استوار ہوتے۔ انہوں نے مجھے نہ صرف "ورق" جھنگ کی فائلیں عطا کیں بلکہ امجد کا چند دیگر کلام بھی فراہم کیا۔ پھر جناب جاوید قریشی کی عنایت سے مجید امجد کے مسودات میری نظر سے گزرے۔ میں نے اس سارے انمول خزانے کو بہت وقت صرف کر کے ترتیب دیا۔ بعض نظموں کے سنین تخلیق امجد صاحب نے تحریر نہیں کیے تھے۔ انہیں تلاش کر کے فراہم کیے۔ بڑی جستجو کے بعد میں اس قابل ہوا کہ تمام کلام کو تاریخی ترتیب سے یکجا کر سکوں۔ اس کے بعد مسئلہ یہ تھا کہ امجد صاحب اپنے کلام پر مسلسل محنت کرتے رہتے تھے۔ ترمیم و تنسیخ کا یہ عمل غیر مختتم تھا۔ نتیجہ یہ کہ بعض نظموں کے ایک سے زیادہ "ورژن" موجود تھے۔ ان میں سے کون سا "ورژن" شاعر کی منشا کے مطابق تھا اور کون سا نہیں تھا؟ اس الجھن کو سلجھانا سہل نہیں تھا۔ اکثر جگہ میں نے آخری "ورژن" کو ترجیح دی مگر چند نظموں میں دونوں ورژن بہتر معلوم ہوا اس

ہے اس کو اختیار کیا گیا۔ مجید امجد کی بہت سی نظموں میں لفظی تبدیلیاں ملتی ہیں۔ رسائل میں پہلی دفعہ اور طرح سے شائع ہوئی ہیں اور بعد میں چند الفاظ تبدیل کر کے قدرے مختلف صورت میں چھپوا دی گئی ہیں۔ بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں کہ آگے پیچھے مختلف رسائل میں چھپنے والی نظموں میں سے آخری ورژن کون سا ہے کیونکہ یہ بھی ممکن ہے چند ماہ بعد چھپنے والی نظم ترمیم کے مراحل سے چند ماہ پہلے گزر چکی ہو۔ ان الجھنوں کو تقابلی مطالعے کے بعد سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک اور بڑا مسئلہ بعض الفاظ کی صحت یا عدم صحت کا ہے۔ امجد کے ہاں متعدد غیر مستعمل الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ بعض الفاظ اور تراکیب انہوں نے خود تراشی ہیں۔ اس لیے رسائل میں مدیر اور کاتب انہیں درست پڑھ نہیں سکے۔ چنانچہ متعدد الفاظ بار بار غلط نقل ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ اس قسم کی لفظی الجھنوں کو جہاں تک ممکن ہو سکے سلجھایا جائے۔ اس طول کلامی کے بعد شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کلیات مجید امجد محض جلد بازی میں جمع کیا ہوا پشتارہ نہیں ہے بلکہ تلاش، تجسس، تحقیق اور توجہ سے شیرازہ بند کیا ہوا مجموعہ ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہ کلام مجید امجد پر تنقید کے لیے ایک مضبوط بنیاد ثابت ہو چکا ہے۔ امید ہے اس کا موجودہ ایڈیشن پہلے سے زیادہ پسند کیا جائے گا۔

الحمد پبلی کیشنز کے صفدر حسین صاحب میرے عزیز دوست ہیں۔ کلیات مجید امجد کی یہ اشاعت نو ان کے ذوقِ طباعت کی عکاسی کرتی ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس ضخیم کلیات کی اشاعت کا اہتمام کیا اور اسے عام قاری کی دسترس میں رکھنے کی سعی کی۔

خواجہ محمد زکریا

۶ ستمبر ۲۰۰۳ء

موجِ تبسم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ابھی تیروں کو ترکش ہی میں ڈالے دیوتا کیوپڈ
کھڑا تھا کماں کو بھی سنبھالے دیوتا کیوپڈ

جہاں پر حکمراں تھی ایک ہیبت خیز خاموشی
مصیبت ریز خوف آمیز ہول انگیز خاموشی

یکایک بجلیاں ٹوٹیں فضائے بزمِ ہستی میں
ہزاروں جاگ اٹھے فتنے اس دنیا کی بستی میں

خموش و پرسکوں عالم میں دوڑی روحِ بیتابی
ہوئی ہر ذرہ رقصاں میں پیدا شانِ سیمابی

سمندر کی روانی ہو گئی تبدیل طوفاں میں
پڑا شورش گلوں کے قہقہوں کا غل گلستاں میں

شبستانوں سے رندوں کی صدائے ہاؤ ہو اٹھی
دبستانوں سے بلبل کی نوائے ہاؤ ہو اٹھی

پٹخنے لگ گئی سر جوئے ساری چٹانوں سے
مچل کر بجلیاں ٹوٹیں زمیں پر آسمانوں سے

اٹھایا شور افزا آبشاروں نے رباب اپنا
سنایا گا کے جھرنے نے گزشتہ شب کا خواب اپنا

حیاتِ تازہ یوں دوڑی دلوں کی کائناتوں میں
کہ جیسے برق چمکے برشگالی کالی راتوں میں

یہ ہستی میں کیف و ذوق کا کیسا سماں آیا
ریاضِ دہر میں اک رنگ و بو کا کارواں آیا
جہاں کی رونمائی ہو گئی ہر سمت کیف و مستی
نشوں کی ایک دنیا اور کیفیت کی بستی
فلک اک گنبدِ زریں زمیں اک بقعۂ نوریں
یہ ساری کائنات شش جہت اک جلوۂ رنگیں
یہ موجِ بحرِ امکاں جلوۂ موجِ تبسم ہے
چمک کر جو ترے لب پر فروغ افزائے عالم ہے
تبسم جس کی رنگینی ترے ہونٹوں پہ رقصاں ہے
تبسم آہ جس کا رقص مضرابِ رگِ جاں ہے

(۱۹۳۴ء)

اقبال

اقبال! کیوں نہ تجھ کو کہیں شاعرِ حیات
ہے تیرا قلب محرمِ اسرارِ کائنات

سرگرمیٔ دوام ہے تیرے لیے حیات
میدانِ کارزار ہے تجھ کو یہ کائنات

مشرق تری نظر میں ہے امید کا افق
مغرب تری نگاہ میں ہے غرقِ سیئات

یورپ کی ساری شوکتیں تیرے لیے سراب
ہنگامۂ تمدنِ افرنگ بے ثبات

اسلامیوں کے فلسفے میں دیکھتا ہے تو
منظومۂ کائنات کی واحد رہِ نجات

تیرا کلام جس کو کہ بانگِ درا کہیں
تیرا ہے نقطے نقطے میں قرآں کے نکات

بھولے ہوؤں کو تو نے دیا درسِ زندگی
زیبا ہے گر کہیں تجھے خضرِ رہِ حیات

سینے میں تیرے عشق کی بیتاب شورشیں
محفل میں تیری قدس کی رقصاں تجلیات

عریاں تری نگاہ میں اسرارِ کن فکاں
مضمر ترے ضمیر میں تقدیرِ کائنات

دنیا کا ایک شاعرِ اعظم کہیں تجھے
اسلام کی کچھار کا ضیغم کہیں تجھے

(۱۹۳۳ء)

ہوائی جہاز کو دیکھ کر

یہ تہذیب اور سائنس کی ترقی کا ثمر ہے — پہنچ گیا ہے اب تک پرندوں کی طرح انساں
یہ علم و دانش و حکمت کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے — ہوا میں لگ گیا اڑنے پرندوں کی طرح انساں

وہ دیکھو ہیں فضا میں مائلِ پرواز طیارے — اُبھرتے، گھومتے، مُڑتے، سنبھلتے اور چکراتے
فضائے آسماں کی سیر کرنے والے سیارے — وہ دیکھو جا رہے ہیں سنسناتے، گونجتے، گاتے

اُدھر وہ خوش نصیب و صاحبِ اقبال انساں ہیں — جنھیں بخشی گئی ان برق پاروں کی عناں گیری
اُدھر وہ ذوقِ علم و فن سے مالامال انساں ہیں — جنھیں سونپی گئی دنیا ہے حکمت کی جہانگیری

ادھر ہم لوگ ہیں کیفیتِ فکر و نظر جن کی — جہاں میں قوتِ پرواز سے محروم رہتی ہے
ادھر ہم لوگ ہیں دنیا میں جن کی مضمحل ہستی — حیاتِ جاوداں کے راز سے محروم رہتی ہے

اگر یہ آرزو انساں کے دل میں جلوہ گر ہوگی — کہ [illegible] سرمدی کی [illegible] سے
تو اس کی زندگی تابندہ تر پائندہ تر ہوگی — فقط سعیِ مسلسل سے فقط ذوقِ تجسس سے

(-۱۲-۱۹۴۴)

آہ یہ خوش گوار نظارے!

سامنے کیا ہے اک پہاڑی ہے
خوب صورت' بلند اور شاداب

اس کی چھیں بر جبیں چٹانوں پر
رقص کرتے ہیں سایہ ہائے سحاب

اس کی خاموش وادیاں' یعنی
ایک سویا ہُوا جہانِ شباب

اس کی سقف بلند سے آگے
آسماں ایک سرنگوں محراب

شام کے وقت کوہ کا منظر
جیسے بھولا ہوا طلسمی خواب

گھومتے' ناچتے ہوئے چشمے
پھوٹتا' پھیلتا ہُوا سیماب

دُوب کی رینگتی ہوئی بیلیں
پتھروں سے پٹے ہوئے تالاب

آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

چیل کے اُف یہ بے شمار درخت — اور یہ اُن کی عنبریں بو باس
سنبلیں کونپلوں سے چھنتے ہوئے — یہ نسیمِ شمال کے انفاس
سایہ ہائے دراز کے نیچے — سرنگوں جھاڑیوں کا خوف و ہراس
چیل کی چوٹیوں پہ صبح کے وقت — سبز پتوں کا زرنگار لباس
یہ دھنواں جھونپڑوں سے اُٹھتا ہوا — کوہ کے اس طرف افق کے پاس
یہ برستی ہوئی گھٹا کا سماں — قلبِ شاعر پہ بارشِ احساس

آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

مرغزاروں میں تا بحدِ نظر — لطف افزا فضا مہکتی ہوئی
شب کو دہقاں کے تنگ جھونپڑے سے — سرخ سی روشنی جھلکتی ہوئی
ابر میں کوندتی ہوئی بجلی — دامنِ آتشیں جھٹکتی ہوئی
کوہ کی سربلند چوٹی سے — اک نئی تازگی ٹپکتی ہوئی

آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

وادیوں کا ہر ایک خار حقیر — امتداد زمانہ کی تصویر
قدسیوں کی ادائے نغمگی — صبح کے آفتاب کی تنویر
جلوہ ہائے شفق کی عریانی — ایک رنگین خواب کی تعبیر
زمہریری ہوا کے جھونکوں سے — ڈبڈبائی ہوئی سی چشم اثیر

آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

چاہتا ہوں کہ اپنی ہستی کو — سردی کیف میں ڈبو جاؤں
چاہتا ہوں کہ ان فضاؤں کی — وسعت بیکراں میں کھو جاؤں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں — جذب ہو جاؤں جذب ہو جاؤں

آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

(۱۹۳۴ء)

محبوبِ خداؐ

نو بہارِ گلستانِ معرفت　　یعنی اے روحِ روانِ معرفت

تیرے دل میں جلوۂ ربِ جلیل　　تیری محفل میں سرودِ جبرئیل

اہتمام و اہتزازِ کائنات　　تیری اک ادنیٰ نگاہِ التفات

قرب یابِ درگہِ یزداں ہے تو　　ساقیِ خُم خانۂ عرفاں ہے تو

جھک رہا ہے تیرے در پر آسماں　　چومتا ہے تیرے قدموں کو جہاں

تبسم سے دل کی کلیاں کھل گئیں　　بدنصیبوں کو مرادیں مل گئیں

تیری چوکھٹ پر جھکی جس کی جبیں　　ہو گیا اس کے جہاں زیرِ نگیں

میں سمجھتا ہوں کہ تیری خاکِ پا　　کیمیا ہے کیمیا ہے کیمیا

مجھ پہ گر تو لطف فرمائی کرے　　بخت میرا نازِ دارائی کرے

میں بھی ہوں اک بندۂ عصیاں شعار　　کشتۂ جور و جفائے روزگار

میں بھی تیرا بستۂ فتراک ہوں　　کس قدر غمگین ہوں غمناک ہوں

میں زمانے بھر سے ٹھکرایا گیا　　میں ہر اک محفل سے اُٹھوایا گیا

درگہِ عالم سے دھتکارا ہوا　　بخت اور تقدیر کا مارا ہوا

اب ترے دربار میں آیا ہوں میں　　دل میں لاکھوں حسرتیں لایا ہوں میں

مجھ کو یہ غم ہے وہ اک لمحۂ نایاب کہ جو
حاصلِ سلطنتِ عالمِ امکانی ہے
جب مری زیست کے محور سے جسم ہو بھی گیا تب مجھے معلوم ہوا
تب میں سمجھا کہ یہ راتیں، یہ گھروندے، یہ چمکتی دنیا
اب یہ سب یہ جو غمِ جاوداں اک وحشت ہے
اب یہی زخم ہیں اور شغلِ سخن رانی ہے

آج بھی جب کہیں رستے میں کسی موڑ، کسی منزل پر
کسی دیوار سے منظر بھی پھسل جاتا ہے
کوئی دامن کہ جسے نازِ گل افشانی ہے
دھوپ میں سوکھتی خوشبو کی چنگیروں سے بھرے آنچلوں سے
ایک پل سے کہ ارمان جب سمٹتے ہیں تو دھیرے دھیرے
کوئی سسکی مرے احساس میں بھر جاتی ہے
تیرے بربط کی کوئی لرزشِ پنہانی ہے

جو شب و روز کے پیالوں میں فغاں بن کے بکھر جاتی ہے
آسمانوں سے زمینوں سے کسی دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
کوئی پیچھے سے مرے کان میں کہہ جاتا ہے
سنتے ہو کس کی یہ آواز ہے پہچانی ہے؟

تجھ کو میری بے کسی کا واسطہ
اپنی شانِ خسروی کا واسطہ

مرحمت ہو زندگی کا جام دے
رحمتِ بے حد کا پیغام دے

اب زمانے میں مرا کوئی نہیں
آسرا تیرے سوا کوئی نہیں

اک فقط درد آشنا تو ہی تو ہے
میرے دل کا مدعا تو ہی تو ہے

جب ترے دربار میں آتا ہوں میں
جب تری سرکار میں آتا ہوں میں

عظمتِ مقصود کو پاتا ہوں میں
منزلِ مقصود کو پاتا ہوں میں

تیرے آگے ہاتھ پھیلاتا ہوں میں
جھولیاں بھر بھر کے جاتا ہوں میں

زندگی کی زندگی تو ہی تو ہے
روح کی تابندگی تو ہی تو ہے

میرے دل کو مہبطِ انوار کر
مجھ کو بھی بیندۂ اسرار کر

(۱۹۳۴ء)

رازِ گراں بہا

نہ رہنما سے تعلق نہ راستہ معلوم　　ترے جنونِ تجسس کا منتہا معلوم

نہ آرزوئے ترقی نہ جستجوئے کمال　　تری حیات کا مقصد ہے کیا خدا معلوم

یہی ہے حال اگر پستیٔ عزائم کا　　مآلِ خواہشِ تکمیلِ ارتقا معلوم

نہاں ہے محنتِ پیہم میں راحتِ جاوید　　نہیں ہے تجھ کو یہ رازِ گراں بہا معلوم

تو اجتماعِ مصائب سے ڈر رہا ہے کیوں　　نہیں تحملِ آفات کا صلا معلوم!

حریمِ قدس کی رنگینیوں کا مرکز ہے
وہ دل کہ جس کو نہیں خوفِ ماسوا معلوم

(۲۳-۱۲-۱۹۴۳)

گاؤں

یہ تنگ و تار جھونپڑیاں گھاس پھوس کی
اب تک جنھیں ہوا نہ تمدن کی چھو سکی

ان جھونپڑوں سے دور اور اس پار کھیت کے
یہ جھاڑیوں کے جھنڈ یہ انبار ریت کے

یہ سادگی کے رنگ میں ڈوبا ہوا جہاں
ہنگامہ جہاں ہے سکوں آشنا جہاں

یہ دوپہر کو کیکروں کی چھاؤں کے تلے
گرمی سے ہانپتی ہوئی بھینسوں کے سلسلے

ریوڑ یہ بھیڑ بکریوں کے اونگھتے ہوئے
جھک کر ہر ایک چیز کی بو سونگھتے ہوئے

یہ آندھیوں کے خوف سے سہمی ہوئی فضا
جنگل کی جھاڑیوں سے سنکتی ہوئی ہوا

یہ شام کے مناظر رنگیں کی خامشی
اور اس میں گونجتی ہوئی جھینگر کی راگنی

بچے غبار راہگزر پھانکتے ہوئے
میدان میں مویشیوں کو ہانکتے ہوئے

برفاب کے دفینے اگلتا ہوا کنواں
یہ گھنگھروؤں کی تال پہ چلتا ہوا کنواں

یہ کھیت یہ درخت یہ شاداب گرد و پیش
سیلاب رنگ و بو سے یہ سیراب گرد و پیش

مست شباب کھیتیوں کی گلفشانیاں
دوشیزۂ بہار کی اٹھتی جوانیاں

یہ نزہت مظاہر قدرت کی جلوہ گہ
ہاں ہاں یہ حسن شاہد فطرت کی جلوہ گہ

دنیا میں جس کو کہتے ہیں گاؤں یہی تو ہے
طوبیٰ کی شاخ سبز کی چھاؤں یہی تو ہے

(۲۴-۷-۱۹۳۵)

حالی

مسدس کا مصنف شاعر بے بدیل حالی — وہ حالی عندلیب گلشن ہندوستاں حالی

قلم کی نوک سے جس نے رباب دل کو چھیڑا — حریم قدس کا وہ مطرب شیریں زباں حالی

جہاں آرا نظر جس کی رموز آگہی جس کی — وہ اسرار و معارف کا محیط بیکراں حالی

قسمت سنوارے قوم کی جس نے قدم چومے — وہ حالی ہاں وہی شخصیت گردوں نشاں حالی

وہی حالی جسے اہل سخن راز زندگی کہہ دیں

نئے دور کا سرور آواز زندگی کہہ دیں

وہ حالی چھوڑ کر جس نے معانی حسن گل کی — جلا کر مشعل وجد آفریں معنی منزل کی

نئے انداز سے چھیڑی فضائے بزم عالم میں — حدیث دل فروز اسلام کے شان و تجمل کی

وہ حالی توڑ کر جس نے طلسم حسن و جوانی — دکھائی شان موج زندگانی کے تسلسل کی

وہ جس نے حسن بخشا رنگ بدلے — سنائی داستاں اوضاع ملت کے تعطل کی

وہ حالی جس کے آنے سے جہاں میں انقلاب آیا

وہ جس کے شعر سے ہندوستاں میں انقلاب آیا

وہی حالی جو سوتوں کو جگانے کیلئے آیا — وہی حالی جو مُردوں کو جِلانے کیلئے آیا

جسے صحرائے بطحا کے حُدی خوانوں نے چھیڑا تھا — نئی لے میں اسی نغمے کو گانے کیلئے آیا

وہ حالی ہاں وہ مردِ حق جو غمستانِ عالم میں — خدا کے نام کا ڈنکا بجانے کیلئے آیا

وہ حالی وہ معلم مکتبِ اخلاقِ ملت کا — جو ہر انسان کو انساں بنانے کیلئے آیا

وہ حالی جو علمدارِ وقارِ زندگانی ہے
سرورِ جاودانی ہے بہارِ زندگانی ہے

وہی حالی جو اذکار و نصیحت کیلئے آیا — وہی حالی جو ارشاد و ہدایت کیلئے آیا

وہی شاعر کہ جس نے شعر کی طرزِ کہن بدلی — وہی ناقد جو تبلیغِ صداقت کیلئے آیا

وہی رہبر کہ جس نے عمر بھر کی رہنمائی کی — وہ مصلح جو فلاحِ ملک و ملت کیلئے آیا

وہ فخرِ ایشیا، مہرِ سپہرِ شاعری حالی — وہ مردِ حق جو اظہارِ حقیقت کیلئے آیا

وہ جس کے فکرِ کیف انداز نے موتی لٹائے ہیں
وہ جس کے خامۂ سحر آفریں نے گل کھلائے ہیں

وہی حالی کہ جو آئینہ دارِ باکمالی ہے — نظیرِ بے نظیری ہے مثالِ بے مثالی ہے

وہی حالی کہ جس کی شاعری سلکِ لآلی ہے — زباں آبِ زلالی ہے بیاں سحرِ حلالی ہے

وہ جس کے قلب میں ہنگامۂ دردِ نہانی ہے — وہ جس کی روح میں سرمستیٔ تخیلِ عالی ہے

ہے گر قومیت ہندوستاں کا ترجماں کوئی — یقیں رکھو یقیں رکھو وہ حالی ہے وہ حالی ہے

اسی حالی اسی حالی کی یہ صد سالہ برسی ہے
جبھی تو چار سُو شانِ جمالی جلوہ گری ہے

اسی حالی اسی دن کا ہے پیش خیمہ [illegible] ۔۔ [illegible]

لے پہونچے [illegible] رتبے ہیں [illegible] ۔۔ [illegible]

ابھی تک جہاں بے امتیاز مذہب و ملت ۔۔ کلام حالی مرحوم کا ہے [illegible]

ابھی تک ہے وہی جیسی ضرورت تھی جو پہلے تھی ۔۔ کلام حالی مرحوم ہے [illegible]

کلام حالی مرحوم اک تیغ معنی ہے
جو ادبیات میں اک شاہکار فنی ہے

ابھی تک چل رہا ہے میکدے میں جام حالی کا ۔۔ ابھی تک مرزبوم ہند میں ہے پیغام حالی کا

ابھی بھولے نہیں اہل جہاں احسان حالی کے ۔۔ زمیں سے آسماں تک غلغلہ ہے عام حالی کا

اسی جانب رواں ہیں قافلے اقوام عالم کے ۔۔ بڑھا جس منزل مقصد کی جانب گام حالی کا

ابھی تک ان فضاؤں میں ہے مضمر روح حالی کی ۔۔ ابھی تک [illegible] لیتا ہے دل میں نام حالی کا

ابھی تک آ رہی ہے عرش سے آواز حالی کی
ابھی تک کان سنتے ہیں نوائے راز حالی کی

سپہر زندگی کا ضوفشاں ناہید ہے حالی ۔۔ نہیں، سر مطلع امید کا خورشید ہے حالی

پیام ولولہ انگیز اس کا مٹ نہیں سکتا ۔۔ جہان زندگی میں زندۂ جاوید ہے حالی

اگر اب بھی نہیں سمجھے تو لو میں برملا کہہ دوں ۔۔ ابھی اک آنے والے دور کی تمہید ہے حالی

چلے گا حشر تک بزم جہاں میں جام حالی کا
رہے گا ثبت لوح کن فکاں پر نام حالی کا

(۱-۱۱-۱۹۳۵)

لہر انقلاب کی

حالت بدل رہی ہے جہانِ خراب کی
لہرا رہی ہے دہر میں لہر انقلاب کی

تہذیبِ حسن نذرِ حدت و شدت کا نام ہے
دنیا میں پھر نمود ہے اُس اضطراب کی

سرمائے کے نظام کا انجام ہے قریب
اب اس کی زندگی ہے کہ ہستی حباب کی

پہنچا ہے اختتام پہ دورِ ملوکیت
حد بھی تو ہو کوئی ستم بے حساب کی

بوڑھوں کی مصلحت کو بھلا پوچھتا ہے کون
سرجوشیاں ہیں جوش پہ روحِ شباب کی

اس عہد کے جوانِ جواں عزم کے لیے
تہذیب نو ہے ایک تجلی سراب کی

پھر جاگ اُٹھا ہے جذبۂ آزادیِ وطن
تعبیر اور کیا ہو غلامی کے خواب کی

امجدؔ تو آنے والے تغیر کو بھانپ جا
مستقبلِ مہیب کی ہیبت سے کانپ جا

(۱۰-۱۹۳۶)

محرومِ ازل

عرصۂ کونین میں کچھ بھی نہیں میرے لیے
خاک ہیں فرشِ زمیں عرشِ بریں میرے لیے

اک جہاں کے واسطے ہے اک جہانِ انبساط
اور ہے اشکوں میں ڈوبی آستیں میرے لیے

دوسروں کے واسطے تاج و سریر و آستاں
بندۂ مجبور کی عاجز جبیں میرے لیے

رات بھر دورِ شرابِ ارغواں ان کے لیے
صبح کو محفل کے خالی ساتگیں میرے لیے

اس خیالِ خام کو رہنے بھی دے اختر شناس
آسماں کی وسعتوں میں کچھ نہیں میرے لیے

(۲۰۰–۹۳۶)

غزل

عشق کی ٹیسیں جو مضراب رگ جاں ہو گئیں
روح کی مدہوش بیداری کا ساماں ہو گئیں

پیار کی میٹھی نظر سے تو نے جب دیکھا مجھے
تلخیاں سب زندگی کی لطف ساماں ہو گئیں

اب لب رنگیں پہ نوریں مسکراہٹ؟ کیا کہوں
بجلیاں گویا شفق زاروں میں رقصاں ہو گئیں

ماجرائے شوق کی بے باکیاں ان پر نثار
ہائے وہ آنکھیں جو ضبط غم میں گریاں ہو گئیں

چھپ گئیں دشواریوں پہ میری سہل انگاریاں
مشکلوں کا اک خیال آیا کہ آساں ہو گئیں

(۲۳-۲-۱۹۲۷)

نذرِ محبت

میں دیتا ہوں مری آنکھوں سے جو آنسو ٹپکتے ہیں

پروتے ہیں لڑی میں موتیوں کی [illegible] نگاہوں میں

یہ موتی جن میں ذرّوں [illegible] سے جو چمکتے ہیں

یہ موتی جو ستارے ہیں عروسِ شب کے دامن میں

یہ موتی جو فرشتے [illegible] الفت سے رکھتے ہیں

بکھرتے ہیں محبت [illegible] آنکھوں [illegible]

مری ہستی کا سرمایہ ہیں یہ در آفریں موتی

کہ جن [illegible] قیمت [illegible] حقیقی

انہی [illegible] موتیوں کو [illegible] دامن میں رکھوں گا

اور آخر [illegible] میں [illegible] ہوں گا

ترے قدموں میں [illegible]

اسی [illegible] میں ترے [illegible] میں [illegible] ہوں گا

اور اپنی زندگی کے آخری مقصد کو پاؤں گا

پسِ پردہ

میری قیام گاہ کی سمت جنوب مغربی
جس میں سفید روغن کی ہے چھوٹی سی ایک جھونپڑی
اس کے دریچے پہ پڑا ہے اک چھپا ہوا
چھینٹ جس سے جھانک کر دیکھتی ہے (سمن)
کاسے کا دودھ زرد کر رہی ہے وہ آگ پہ
میرے قدم کی چاپ پہ آ گئی وہ چونک کر
سہمی ہوئی کھڑی ہے وہ سرو حسین جواں
سانس سے اس کی لرزشِ پردۂ چیں عیاں
دیکھ رہی ہے وہ مجھے جھجکی ہوئی نگاہ سے
جھجکی ہوئی نگاہ کی تابش بے پناہ سے

نووارد

نازنیں، اجنبیِ شہرِ محبت ہوں میں
میں ترے دیس کے اطوار سے ناواقف ہوں

دیدۂ شوق کی بیباک نگاہوں پہ نہ جا
کیا کروں جرأتِ گفتار سے ناواقف ہوں

چل پڑا ہوں ترے دامن کو پکڑ کر لیکن
اس کٹھن جادۂ پُرخار سے ناواقف ہوں

مست ہوں عشرتِ آغاز کی سرمستی میں
میں ابھی عاقبتِ کار سے ناواقف ہوں

سونگھی ہے تری زلفوں سے ابھی بوئے جنوں
ابھی دامن کے پھٹے تار سے ناواقف ہوں

دیکھ لوں تجھ کو تو بے ساختہ پیار آتا ہے
پیار آتا ہے مگر پیار سے ناواقف ہوں

دل میں یہ جذبۂ بیدار ہے کیا؟ تو ہی بتا
میں تو اس جذبۂ بیدار سے ناواقف ہوں

اک مسافر ہوں ترے دیس میں آ نکلا ہوں
اور ترے دیس کے اطوار سے ناواقف ہوں

(۱۴-۹-۱۹۳۷)

جھنگ

یہ خاکداں جو ہیولیٰ ہے ظلمتستاں کا — یہ سرزمیں جو ہے نقشہ جحیم سوزاں کا
یہ تنگ و تیرہ و بے رنگ و بو دیارِ مہیب — یہ طرفہ شہر عجیب و غریب و خفتہ نصیب
یہاں خیال ہے محروم اہتزاز حیات — یہاں حیات ہے وحشت کی ایک کالی رات
یہاں پہ درد دروں کی دوا نہیں ملتی — یہاں پہ قلب و نظر کو غذا نہیں ملتی
یہاں کلیدِ حقیقت نہیں کسی کے پاس — یہاں ہے تحفۂ حسد اور عداوت اور افلاس
یہاں ارادہ و ہمت کی وسعتیں محدود — یہاں عروج و ترقی کے راستے مسدود
ہر اک بشر ہے یہاں تنگدستیوں کے قریب — بلندیوں سے بہت دور پستیوں کے قریب
یہاں نہ روح کو راحت، یہاں نہ دل کو سرور — یہاں ہے طائرِ پر بستہ آدمی کا شعور
یہاں نہ پرورشِ شوقِ علم کے امکاں — یہاں نہ تربیتِ ذوقِ شعر کے ساماں

کبھی سے پاپ کی بھٹی میں سڑ رہا ہوں میں
ندیم جھنگ سے اب تنگ آ گیا ہوں میں

(۱-۱۰-۱۹۳۷)

تیرے بغیر

زندگی [illegible] سا خواب ہے تیرے بغیر

[illegible] اک [illegible] مضطراب ہے تیرے بغیر

[illegible] تاب ہے تیرے بغیر

آنکھوں [illegible] روٹھی ہوئی بے خواب ہے تیرے بغیر

[illegible] آسمان ہے جو مجھ کبھی ہو

[illegible] کتاب ہے تیرے بغیر

[illegible] ساقی [illegible] حیات

زندگی [illegible] ہے تیرے بغیر

[illegible] رائیگاں [illegible] آتش

دل کا ہر اک قطرہ خونناب ہے تیرے بغیر

[illegible] سکوں بحر رواں

[illegible] گرداب ہے تیرے بغیر

میری پاکیزہ جوانی صرف عصیاں ہو نہ جائے

جس تمنا میں وفا تھی سب ہے تیرے بغیر

چاند کی کرنوں سے زینوں پہ قدم دھرتی ہوئی

آ بھی جا سونی شب مہتاب ہے تیرے بغیر

آ کہ پھر اس آسماں کو چھیڑیں تجھ سے کام

دشمن جاں گردش دولاب ہے تیرے بغیر

(۲۰-۱۰-۱۹۴۷)

کیسی دنیا ؟

[illegible]

[illegible]

جس جگہ روٹی کے [illegible] کو ترستے ہیں [illegible]

[illegible] قسمت [illegible]

جس جگہ [illegible] تہذیب [illegible]

[illegible]

جس جگہ انسان [illegible] عقل و ہوش

[illegible] مذہب فروش

جس جگہ [illegible] تہذیب کے پروردگار

جس طرح [illegible]

جس جگہ [illegible]

[illegible]

جس جگہ [illegible]

[illegible]

جس جگہ [illegible]

اور [illegible]

[illegible]

جس [illegible]

[illegible]

شرط

تجھکو یہ ڈر ہے کہ ناموس گہہ عالم میں — عشق کے ہاتھوں نہ ہو جائے تو بدنام کہیں!
آج تک مجھ سے جو شرما کے بھی تو کہہ نہ سکی — وہ ترا راز زمانے میں نہ ہو عام کہیں!
کسی شب ایسا نہ ہو نالۂ بیتاب کے ساتھ — تیرے ہونٹوں سے نکل جائے مرا نام کہیں!
روزن در سے لگی منتظر آنکھوں کا حال — جا کے تاروں سے نہ کہہ دے شفق شام کہیں!
اس کی پاداش میں ساقیٔ فلک چھین نہ لے — مرے ہونٹوں سے ترے ہونٹوں کا یہ جام کہیں!
یہ تری شرط وفا ہے کہ وفا کا قصہ — دیکھ! سن پائے نہ گردش گہ ایام کہیں

ہاں مری روح پہ مسطور ہے یہ شرط تری
مجھے منظور ہے، ہے یہ شرط تری

تو یقین رکھ کہ ترے عشق میں جیتے جیتے — عدم آباد کی آغوش میں سو جاؤں گا
ایکدن دل سے جب آواز شکست آئیگی — اس کے آہنگ فنا رقص میں کھو جاؤں گا
موت کی دیوی کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے جو — جذب اس شعلۂ جاں سوز میں ہو جاؤں گا

اور خدا پوچھے گا وہ راز باصرار ترا
اس کے اصرار سے ٹکرائے گا انکار مرا

(۲۶-۱۲-۱۹۴۷)

اقبال

( )

مشعلِ زندگی کی ضو اقبال — [illegible] اقبال
محفلِ طور جس سے روشن تھی — [illegible] کی ضو اقبال
خس و خاشاک [illegible] میں — [illegible] اقبال
[illegible] — [illegible] اقبال

[illegible] اقبال
[illegible] اقبال

(۲)

ساقیِ [illegible] اقبال — [illegible] کائنات اقبال
موت تہذیب [illegible] جس سے — [illegible] اقبال
جس کے شعروں کا [illegible] — [illegible] کے نکات اقبال
راہِ اسلام [illegible] — [illegible] اقبال

[illegible] اقبال
[illegible] اقبال

ثبت لوحِ جہاں پہ نام اس کا   زندۂ جاوداں کلام اس کا

حشر تک گونجتا رہے گا یوں   دہر میں سرمدی پیام اس کا

تا بدورِ فلک زمانے میں   دور کرتا رہے گا جام اس کا

جس رہِ منزلِ حقیقت پر   اٹھ چکا ہے بڑھتے گام اس کا

تم بھی اس راستے پہ بڑھتے چلو
نردبانِ فلک پہ چڑھتے چلو

(۸-۱-۱۹۴۸)

مطربہ

فضا میں جذبِ موسیقی رواں معلوم ہوتا ہے ‌ ‌ جہاں کا ذرہ ذرہ نغمہ خواں معلوم ہوتا ہے

سنبھلنے دے ذرا او مطربہ بے تاب ہیں نغمے ‌ ‌ جگر کے زخم پر زخمِ سناں معلوم ہوتا ہے

یونہی گائے جا گائے جا ترا سوز آفریں دیپک ‌ ‌ مری ہی زندگی کی داستاں معلوم ہوتا ہے

تو گاتی ہے تو میرے سامنے نظارۂ عالم ‌ ‌ کسی فردوسِ رنگیں کا سماں معلوم ہوتا ہے

تو گاتی ہے تو آنکھیں کھول دیتی ہے انگڑائی
رباب دہر سے نغموں کی موجِ خواب رعنائی

تو گاتی ہے تو تیرے دوش پہ زلفیں جھوم جاتی ہیں ‌ ‌ تو گاتی ہے تو تیری مد بھری آنکھیں بھی گاتی ہیں

تو گاتی ہے تو تیرے چتون خوش رنگ و مژگاں ‌ ‌ شراب حسن کی سرمستیوں میں ڈوب جاتی ہیں

تو گاتی ہے تو گلشن بہشت تیرے سامنے تاباں ہے ‌ ‌ جمالِ زہرہ کی رعنائیاں جادو جگاتی ہیں

تو گاتی ہے تو تیری راگنی کی مست تانوں میں ‌ ‌ مری رگ رگ کو نیشِ درد بن کر گدگداتی ہیں

مرے خلدِ تصور کی فضا کو جگمگائے جا
یونہی گائے جا گائے جا یونہی گائے جا گائے جا

(۲۳-۱-۱۹۳۸)

[illegible]

[illegible]

حسن بھی [illegible] عشق بھی [illegible] مست جوانی

دل [illegible] سب جگمگ [illegible] آتی [illegible]

[illegible] کا [illegible]

[illegible]

دل [illegible] سب جگمگ [illegible] آتی [illegible]

[illegible] کے کھیتوں اور [illegible]

آج [illegible] اور [illegible]

دل [illegible] سب جگمگ [illegible] آتی [illegible]

[illegible]

[illegible]

دل [illegible] سب جگمگ [illegible] آتی [illegible]

([illegible])

عورت

تو پریم مندر کی پاک دیوی تو حسن کی عظمتوں کی رانی
حیات انساں کی قسمتوں پر تری نگاہوں کی حکمرانی
جہانِ الفت تری قلمرو، حریم دل تیری راجدھانی

بہار فطرت ترے لبوں کی دوشیزہ مسکراہٹ
نظام کونین تیری آنکھوں کے سرخ ڈوروں کی تھرتھراہٹ
فروغ صد کائنات تیری جبین سیمیں کی ضوفشانی

بجھے سینوں میں بس رہی ہیں تو رحمتیں تری ادائیں
ترستی روحوں کو جام عشرت پلا رہی ہیں تری وفائیں
رگ جہاں میں تڑپ رہی ہے شراب بن کر تری جوانی

دماغ پروردگار میں جو ازل کے دن سے مچل رہا تھا
زبان تخلیق دہر سے بھی نہ جس کا اظہار ہو سکا تھا
نمود تیری اسی مقدس حسیں تخیل کی ترجمانی

[illegible] تک

[illegible] تک

[illegible] حدیث [illegible] کی خوں چکانی

[illegible] تک

تری محبت [illegible] صحرائے نجد [illegible] تک

[illegible] فریب جنوں کی اک نشانی

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہے زہراب زندگانی

[illegible] کلی کلی میں [illegible] چمن چمن میں

[illegible] شکن شکن میں

کتاب [illegible] زندگی کے ورق ورق پہ تری کہانی

[illegible] جہاں نہ ہوتی

[illegible] مکاں نہ ہوتی

[illegible] کی خاطر [illegible] کی نگرانی

(۳۱-۳-۲۸)

نفیرِ عمل

آؤ کب تک گلہ شوخیٔ تقدیر کریں
کب تک ماتم ناکامیٔ تدبیر کریں

کب تک شیون جورِ فلکِ پیر کریں
کب تک شکوۂ بے مہریٔ ایام کریں

نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

آج بربادِ خزاں ہے چمنستانِ وطن
آج محرومِ تجلی ہے شبستانِ وطن

ہر طرف نالہ و شیون ہے دبستانِ وطن
وقت ہے چارۂ دردِ دلِ ناکام کریں

نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

آؤ اجڑی ہوئی بستی کو پھر آباد کریں
آؤ جکڑی ہوئی روحوں کو پھر آزاد کریں

آؤ کچھ پیرویٔ مسلکِ فرہاد کریں
یہ نہیں شرطِ وفا بیٹھ کے آرام کریں

نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

ایک ہنگامہ سا ہے آج جہاں میں برپا
آج بھائی ہے سگے بھائی کے خوں کا پیاسا

آج ڈھونڈے سے نہیں ملتی زمانے میں وفا
آؤ اس جنسِ گراں مایہ کو پھر عام کریں

نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

جو محبت سے ہماری شکایت سے منہ موڑیں — نفرت و وحشت سے رقابت سے منہ موڑیں

ہم جواں ہیں تو یہاں کی کشت سے منہ موڑیں — ہم جواں ہیں تو نہ کچھ خدشۂ آلام کریں

نوجوانانِ وطن آؤ کوئی کام کریں

رشتہ ہم ... یہ توڑ بھی دیں توڑ بھی دیں — کاسہ جو ہیں ... چھوڑ بھی دیں چھوڑ بھی دیا

اپنی ہی طرف ... چھوڑ بھی دیں چھوڑ بھی دیں — آؤ کچھ کام کریں کام کریں کام کریں

نوجوانانِ وطن آؤ کوئی کام کریں

(۸-۵-۱۹۳۸)

ابرِ صبوح

تیرتے بادل خنک جھونکے فضا میں ہیں رواں　　آسماں پر ناچتی اُڑتی ابابیلوں کے راگ

اس طرح لہرا رہی ہیں اودی اودی ندیاں　　جیسے اک عفریت کے دوش پر زلفوں کے ناگ

جیسے نیلی جھیل میں کشتی ہو کشتی سے اور تنی

جیسے آتی ہو نئے معصوم پنہارن کوئی

گدرے گدرے ابر پاروں کی جھلکتی چھاگلیں　　اس طرح چھلکا رہی ہیں رس بھری مدرا کا جھاگ

جس طرح رو رو کے کوئی مجبور پی کی یاد میں　　سونپ دے جذبات کی اندھیاریوں کو دل کی باگ

جیسے گیتی کھیتیوں سے مغبچہ ہائے بہشت

بہہ رہے ہوں حور کے گیسو میں صہبائے بہشت

وہ بہکتی کالی گھٹا اٹھی مری مست شباب　　وہ اُڑا جاتا ہے بادل ہاں زندگی کا جھاگ

بجھ چلی ہے روح کا آتش کدہ والی بھی شراب　　چھلکنے دے میرے لب پہ مری بستی کی آگ

تجھ کو جادو سے ان بجھتے شراروں کی قسم

ان ہواؤں کی قسم ان ابر پاروں کی قسم

(۱ ۲-۱۹۳۸)

سرِ بام!

لو آ گئی وہ سرِ بام مسکراتی ہوئی
لیے اچٹتی نگاہوں میں اک پیامِ خموش

یہ دھندلی دھندلی فضاؤں میں انعکاسِ شفق
یہ سونی راہ، یہ تنہا گلی، یہ شامِ خموش

گلی کے موڑ پہ اک گھر کی مختصر دیوار
یہ چھت جس پہ دھندلکوں کا ازدحامِ خموش

یہ چھت کسی کے سلیپر کی چاپ سے واقف
کسی کے گیتوں سے آباد یہ مقامِ خموش

کسی کے ہونٹوں کے انگارے یہ چاروں طرف
تبسموں کے ضیا پاروں کا خرامِ خموش

کسی کے مدبھرے نینوں سے یہ برستا خمار
کسی کی نقرئی بانہوں کا یہ سلامِ خموش

منڈیر پہ بصد انداز کہنیاں ٹیکے
کھڑی ہوئی ہے کوئی شوخ لالہ فامِ خموش

لیے اچٹتی نگاہوں میں اک پیامِ خموش

(۱۸-۶-۱۹۳۸)

قیدی

سخت زنجیریں ہیں قیدی، سخت زنجیریں ہیں یہ
ان کو ڈھالا ہے جہنم کی بھٹی آگ میں
ان کی کڑیاں موت کے پھنکارتے ناگوں سے بنیں
ان کی لڑیاں زندگی کی الجھنوں سے ملے
ان کی پیمائش سے آگے تیری ہمتیں ہیں یہ
تیری تدبیریں؟ عبث سب تیری تدبیریں ہیں یہ
سخت زنجیریں ہیں قیدی، سخت زنجیریں ہیں یہ

بیڑیاں، قیدی ترے پاؤں میں ہیں تاگے نہیں
دیکھ پاپی! اپنے سر پر تیز سنگینوں کی چھت
چار سو لوہے کی سیخوں کی فصیل بیکراں
تو پڑا ہے سست پا بے حس و حرکت بے سکت
اور ادھر اس سوچ میں ہیں تیرے ظالم پاسباں
دکھ کی کالی کوٹھڑی سے تو کہیں بھاگے نہیں
بیڑیاں، قیدی، ترے پاؤں میں ہیں تاگے نہیں

(۲۹-۹ ۱۹۳۸)

کون؟

زمانے پہ چھاتی ہیں جب کالی راتیں
مرے دل سے کون آ کے کرتا ہے باتیں؟

چمکتے ہیں جب جھلملاتے ستارے
مرے من میں کیوں کوندتے ہیں شرارے؟

اُمڈتی ہے جب کہکشاں چندر گاگر
ابھرتا ہے کیوں میرے اشکوں کا ساگر؟

گزرتے ہیں جب بادلوں سے سفینے
بھڑک اُٹھتے ہیں کیوں امیدوں کے سینے؟

کلی جب ہے شبنم سے مخمور سجتی
مری روح میں کس کی بنسی ہے بجتی؟

گلستاں میں جب پھول کھلتے ہیں ہر سو
مجھے کس کی زلفوں کی آتی ہے خوشبو؟

یہ کیا بھید ہے کون ہے وہ ہستی
ہے آباد جس سے مرے من کی بستی

ہر اک منظرِ خوش نما روپ دھارے
مری روح سے کر رہی ہے اشارے

میں اس شکلِ موہوم کو ڈھونڈتا ہوں
میں اس سرِ مکتوم کو ڈھونڈتا ہوں

(۱-۱۱-۱۹۴۸)

صبحِ نو

اے دوست اٹھو دیکھو کہ پت جھڑ کی رت گئی   چٹکی ہیں پھر سے باغ میں کلیاں نئی نئی

پھر جاگ اٹھی ہیں راگنیاں آبشار کی   پھر جھومتی ہیں ڈالیاں سبزہ زار کی

پھر بن رہا ہے کیف نیا جام تصور کا

پھر آ رہا ہے لوٹ کے موسم بہار کا

اے دوست کیوں ہے آج تصور کی جھڑپ ہیں   یہ سیل جوش رنگ ربابوں میں تیرے پاس

گل سا مسکراتا ہوا، شبنمی پھول   پروردگار عشق کا ہے یہ نیا رسول

آتا ہے اک پیام رسانی کے واسطے   بھرنے زمیں کی دامنی کے واسطے

اے دوست ایک پھول کی قیمت ہے زندگی   اے دوست ایک سانس کی مہلت ہے زندگی

لو بیت بھی چکی رات اضطراب کی   آنچل بھرو ذوق سے عراقی شراب کی

آ دیکھ آئینہ ہے قسمت مرے حبیب،

آیا ہے پھر بہار کا موسم اے نصیب،

(۹-۴-۱۹۳۸)

ریل کا سفر

کراچی کو جاتی ہوئی ڈاک گاڑی
دھوئیں سے سمندر میں تیراک گاڑی

مسافت کو یوں طے کیے جا رہی ہے
سفر کو غناغٹ پیے جا رہی ہے

یہ چٹیل سے میداں یہ ریتوں سے ٹیلے
ہیں جن پر بچھے ہوئے سے زرد تیلے

یہ کپاس کی کھیتیوں کی بہاریں
یہ ڈوڈوں کو چنتی ہوئی گلعذاریں

گھنے بن کی پھلواڑیوں کی مہک وہ
اور ان پر پرندوں کی رنگتوں سے پرتو

یہ چھوٹی سی بستی، یہ جل اور یہ بانی
یہ صحرا میں آوارہ بھیڑوں سے پالی

یہ حیران بچے یہ خاموش مائیں
یہ گوری کی چھینٹوں سے لتھڑی قبائیں

یہ نہروں میں بہتا ہوا مست پانی
یہ گنوں کی رت کی سنہری جوانی

یہ اینٹوں کا آوا، یہ اونٹوں کی ڈاریں
یہ کیکر کے پیڑوں کی لمبی قطاریں

درختوں کے سایوں سے آباد رستے
یہ آزاد راہی، یہ آزاد رستے

بدلتے چلے جا رہے ہیں نظارے
نئے سے نئے آ رہے ہیں نظارے

یہ صحرا جو نظروں کو برما رہا ہے
مرے ساتھ بھاگا چلا آ رہا ہے

نظر ایک منظر پہ جمتی نہیں ہے
یہ موج آکے ساحل پہ تھمتی نہیں ہے

یہ سچ ہے

یہ سچ ہے اس کی دُنیا میں کوئی قیمت نہیں ہوتی
پڑا رہتا ہے جب تک بحر کی آغوش میں موتی
یہ سچ ہے پھول جب تک شاخ سے توڑا نہیں جاتا
کسی کے گیسوئے پُر پیچ میں جوڑا نہیں جاتا
شرابِ ناب جب تک بٹ نہیں جاتی کٹوروں میں
جھلک سکتی نہیں ان مدبھری آنکھوں کے ڈوروں میں
یہ سچ ہے جب ندی اپنی روانی چھوڑ دیتی ہے
تو اس کے ساز کے تاروں کو فطرت توڑ دیتی ہے
یہ سچ ہے اپنے جوہر کھو رہا ہوں دیس میں رہ کر
گزرتی زندگی کو رو رہا ہوں دیس میں رہ کر

انقلاب

مری آنکھوں میں بسے رہتے تھے آنسو جب تک ۔ دل کی دنیا مری درد سے پیوند رہے

آہوں سے دل کی آگ کی شمع جلتی رہی ۔ خشک ہونٹوں سے شرابوں کی طلب جلتی رہی

نیند کا چین گیا جاگتے کی بات گئی ۔ شوقوں کا دن گیا اور مستیوں کی رات گئی

دردوں کے سینوں میں جلتی ہوئی نیند رہی ۔ قرمزی رنگوں میں خوابوں کی دنیا نہ رہی

ڈال رکھی تھی تخیل نے جو نیلا پردا ۔ رخ ہستی سے ہے اٹھنے لگا رفتہ رفتہ

اب حقیقت مری آنکھوں سے قریب آتی ہے ۔ نظر اب دنیا کی تصویر عجیب آتی ہے

اب تبسم مجھے غنچوں کا رلا دیتا ہے ۔ دل کے شعلوں کو ہر اک جھونکا ہوا دیتا ہے

حسن کے ناز و ادا پہچانتا ہوں جانتا ہوں ۔ حسن کا سحر اس کا فسوں مانتا ہوں

چاندنی قاش سے ماتھے کی صباحت اچھی ہے ۔ پھول کی طرح حسین چہرے کی رنگت اچھی ہے

مست نظروں میں شرابوں کی ملاوٹ اچھی ہے ۔ سرخ ہونٹوں میں نباتوں کی حلاوت اچھی ہے

دیکھتی ہیں مگر اب میری نگاہیں کچھ اور ۔ اب مرے فکر پہ ہیں تخیل کی راہیں کچھ اور

اب ہر اک شے کی حقیقت پہ گماں رکھتا ہوں ۔ اپنی تخیل کے قدموں پہ جبیں رکھتا ہوں

دیکھتا ہوں کہ نہیں ہے کچھ بھی یہاں میرے بغیر ۔ خس و خاشاک کا ہے ڈھیر جہاں میرے بغیر

حسن اک دھوکا ہے اور عشق ہی خود بھول ہے اک
تتلی کیوں گل پہ گرے تتلی ہی خود پھول ہے اک

(۱-۱-۱۹۳۹)

یہیں پہ رہنے دے صیاد آشیانہ مرا

یہ باغ تیرا ہے یہ پھول تیرے ہیں چن لے
گلوں سے ریشوں سے دامن کوئی بن لے
ابھی کچھ خدا سے ایک آدھ تن لے
مرے بغیر اجڑ جائے گا ٹھکانہ مرا
یہیں پہ رہنے دے صیاد، آشیانہ مرا

یہ سچ ہے، تیرے چمن سے چرایا ہے میں نے
یہ ایک تنکا یہیں سے اٹھایا ہے میں نے
کہ جس پہ اپنا بسیرا بسایا ہے میں نے
ترے چمن میں تھا حق اس قدر بھی کیا نہ مرا؟
یہیں پہ رہنے دے صیاد آشیانہ مرا

یہیں پہ بیٹھ کے میں چپکے چپکے روؤں گا
کلی کلی مجھے چھیڑے گی میں نہ بولوں گا
نہ گاؤں گا میں زباں تک نہ اپنی کھولوں گا
تری فضاؤں پہ گر بار ہے ترانہ مرا
یہیں پہ رہنے دے صیاد' آشیانہ مرا

تجھے ہے یاد؟ یہاں ایک پنچھی رہتا تھا
وہ جس کے نغموں کی رو میں زمانہ بہتا تھا
یہاں سے جانے لگا وہ تو روتے کہتا تھا
"رفیق' جاتا ہوں' پھر جانے کب ہو آنا مرا
ترے سپرد یہ چھوٹا سا آشیانہ مرا"

اندھیرے میں کوئی پتا جو سرسراتا ہے
تو اب بھی راتوں کو دل میرا چونک جاتا ہے
سمجھتا ہوں وہ مرا ہم سرود آتا ہے
ہے جس کی ایک امانت یہ آشیانہ مرا
یہ ٹوٹی ٹہنی پہ برباد سا ٹھکانہ مرا

کبھی تو آئے گا وہ مژدۂ امید لیے
اِک اور جنتِ گلپوش کی کلید لیے
اِک اور گلشنِ آزاد کی نوید لیے
بنا کے نام باندازِ مجرمانہ مرا
وہ آئے سر پہ اٹھائے گا آشیانہ مرا

وہ دیکھو شاخیں ہلی ہیں — وہ آ رہا ہوگا
حسین کلیاں کھلی ہیں — وہ آ رہا ہوگا
زمیں رتوں سے ملی ہیں — وہ آ رہا ہوگا
یہیں، اِدھر ہی، وہ شاخِ شکستہ پڑا تھا مرا
ستم پہ رہ گئے وہ صید، آشیانہ مرا

(۱-۴-۱۹۴۹)

بیساکھ

شاد ہو کہ آئی فصلوں نرالیوں کی رت

آئی ہنسی کھیلوں کی بہاروں کی رت !

گاؤں کے مرد و زن نے آنگن میں درانتیاں

آئی سنہری کھیتیوں کی [illegible] کی رت

[illegible] کی فصل کاٹنے کے خوشگوار دن

محنت کشوں کی [illegible] کی رت

[illegible] سے [illegible] سے [illegible] کا

صحراؤں سے [illegible] کی رت

کھیتوں میں [illegible] کا موسم

[illegible] کی رت

دہقاں کی امید کی بر آوری کا وقت

[illegible] سے [illegible] کی انگڑائیوں کی رت

(۲۴-۴-۹۳۶)

غزل

یہ دنیا ہے اے قلبِ مضطر سنبھل جا
یہاں ہر قدم پہ ہے ٹھوکر سنبھل جا

بڑے شوق سے پی مگر پی کے مت گر
ہتھیلی پہ ہے تیری ساغر سنبھل جا

جہاں حق کی قسمت ہے سولی کا تختہ
یہاں جھوٹ ہے زیبِ منبر سنبھل جا

قیامت کہاں کی، جزا کیا، سزا کیا
ہے ہر سانس اک تازہ محشر سنبھل جا

وہ طوفاں نے پُر خوف جبڑوں کو کھولا
وہ بدلے ہواؤں کے تیور سنبھل جا

نہیں اس خرابات میں اذنِ لغزش
یہ دنیا ہے اے قلبِ مضطر سنبھل جا

(۳۰-۴-۱۹۳۹)

قیصریت

[illegible]

[illegible]

اس سپاہی کا وہ اکلوتا یتیم — آنکھ گریاں، روح لرزاں، دل دونیم

بادشہ کے محل کی چوکھٹ کے پاس — لے کے آیا بھیک کے ٹکڑے کی آس

اسکے ننگے تن پہ کوڑے مار کر — پہرے داروں نے کیا دھتکار کر

کیا ترے مرنے کی باری آ گئی — دیکھ وہ شہ کی سواری آ گئی

وہ مڑا چکرایا اور اوندھا گرا — گھوڑوں کے ٹاپوں تلے روندا گیا

دی رعایا نے صدا ہر سمت سے — ''بادشاہِ مہرباں ! زندہ رہے''

(۲۳-۶-۱۹۳۹)

قیدی دوست

میرے قیدی دوست! تو خاموش رہتا ہے کیوں؟

اپنے زنداں کی سلاخوں سے ٹکراتا ہے کیوں؟

رات بھر چمکتی آنکھوں سے تکتا ہے تو

بات کیا ہے جو مجھ سے کہہ نہیں سکتا ہے تو

تیرے سینے کی [illegible] راز و سنتا ہوں میں

جب تری زنجیر کی آواز کو سنتا ہوں میں

کہہ دے ساتھی [illegible] ہوا کل رات کو

[illegible] رہے تھے راز کی اس بات کو

[illegible] اس زنداں میں تھے جیسے اسیر

[illegible] میں [illegible] سے تیر

جب آسماں [illegible] کشتی پہ تھے ہم سے سوار

کشتی [illegible] اس جگہ سے پُرخوف طوفانوں سے پار

[illegible] کشتی کی [illegible] بادلوں کے درمیاں

[illegible] آدمیت کا [illegible] بادباں!

اب ہماری قید گہ کے قفل کھولے جائیں گے
اس سفینے پر ہر ایک بدبخت کو لے جائیں گے
اُس جگہ اک دوسرے کے متصل بیٹھیں گے ہم
چند گھڑیوں کے لئے آپس میں مل بیٹھیں گے ہم
اپنی اپنی داستاں رو رو کے کہہ جائیں گے ہم
چند لمحوں کے لئے نشّوں میں بہ جائیں گے ہم
بیڑیوں پر تیری رکھ کے اپنی سیمائے نیاز
میں پڑھوں گا میرے قیدی دوست! اُلفت کی نماز
اتنے میں کشتی کنارے سے لپٹ جائے گی دوست
اور مرے سجدوں کی عمرِ شوق کٹ جائے گی دوست
پھر قدم رکھتے ہی ساحل پر جدا ہو جائیں گے
ازسرِنو قیدیٔ دامِ بلا ہو جائیں گے

(۲۴-۹-۱۹۳۹)

بیسویں صدی کے خدا سے

[illegible]

[illegible] دیکھا ہے

[illegible]

[illegible] دیکھا ہے

[illegible]

[illegible] دیکھا ہے

[illegible]

[illegible] دیکھا ہے

[illegible]

[illegible] دیکھا ہے

[illegible]

[illegible] دیکھا ہے

[illegible]

[illegible]

(۱۸-۷-۱۹۳۹)

بھکشا

پھرتا بچھڑتا دکھ کی وادی میں کھویا کھویا سا — لے کر اپنے اجڑے دل کا ٹوٹا پھوٹا کاسا

آ پہنچا ہے تیرے در پر یہ دکھیا بھکاری — سینے میں طوفان تمنا آنکھ سے آنسو جاری

تیرے اونچے ایواں کی یہ کنگریاں چمکیلی — چوم رہی ہیں جن کو سورج کی کرنیں البیلی

مرمر کی محرابوں کے نیچے وہ بند دریچے — جیسے بیٹھے ہوں جنت کے نہاں آنکھیں میچے

بھینی بھینی خوشبوؤں سے مہکا جالی دار جھروکا — جس کی چلمن پر ہر پل سا یہ رنگیں دھوکا

تیرے دوارے پر آ کر میں اوگن ہار بھکاری — آنکھوں کے رستے ٹپکا کر سینے کی چنگاری

ذروں کو آج اشکوں کی برساتیں بانٹ رہا ہوں — خاک در پر سجدوں کی سوغاتیں بانٹ رہا ہوں

دیکھ لیا اب ذوق ذوق ٹھوکریں کھاتی ہیں بگولے — روح کا پنچھی دل کی گٹی پہ ہے کندھے تولے

خاک میں مل جانے کو ہے اک چندر روپ جوانی

جیون کی بھکشا دے دے او راج محل کی رانی

(۲۲-۷- ۹۳۹)

گر اس جہاں میں جینا ہے

نہ تاجِ سر کو تو بیچ اور نہ تو سریر کو بیچ

گر اس جہاں میں جینا ہے تو ضمیر کو بیچ

حیا کو اپنی نگاہوں سے حکمِ رخصت دے

زباں کو زہر ملے شہد کی حلاوت دے

فریبِ سجدہ سے اپنی جبیں کو واقف کر

ریا کے آنسوؤں سے آستیں کو واقف کر

ہے تیرے دل میں جو چنگاری اس کا نام نہ لے

خودی کا رُتبۂ خود داری! اس کا نام نہ لے

(۱۹۳۹ء)

گھٹا سے

گھٹا! نہ رو! مرے دردوں پہ اشکبار نہ ہو
مجھ ایسے سوختہ ساماں کی غمگسار نہ ہو

لپیٹ لے یہ خنک چادریں ہواؤں کی
کسے طلب ہے تری مست کار چھاؤں کی

تو اپنے ساتھ ہی لے چل یہاں سے جاتے ہوئے
کھلونے اپنی پھواروں کے جھنجھناتے ہوئے

یہ بوندیوں کی نوائیں تجھے مبارک ہوں
یہ بھیگی بھیگی فضائیں تجھے مبارک ہوں

یہ نزہتیں مری محفل سے اے گھٹا لے جا
یہ اپنی بجلیوں کے ارغنوں اٹھا لے جا

میں سن چکا ہوں بہت تیری داستانیں، بس
خموش! مجھ کو نہیں راس تیرے نغموں کا رس!

نہ چھیڑ آج یہ اپنی رسیلی شہنائی!
ہے مشکلوں سے مرے آنسوؤں کو نیند آئی!

(۱-۲-۱۹۴۰)

بیاہی ہوئی سہیلی کا خط

کیا یہ سچ ہے مری سہیلی کہ تم
جلد ہی اب بیاہی جاؤ گی

اک نئی زندگی میں اترو گی
اک نئی قیدگہ بساؤ گی

آج تک جن سے تم بچھڑ نہ سکیں
ان کو اس طرح چھوڑ جاؤ گی

ایک گھونگھٹ کی اوٹ میں چھپ کر
زیست کی قید کاٹ جاؤ گی

نقرئی بندھنوں میں جکڑی ہوئی
راہِ ہستی پہ ڈگمگاؤ گی

پھر بھی آئیں گی چاندنی راتیں
تم مگر یوں نہ گنگناؤ گی

آنکھ میں ہوں گے سرمہ آلود اشک
آہ! تم پھر بھی مسکراؤ گی

آندھیوں کی زدوں میں آئی ہوئی
شمع کی طرح بجھتی جاؤ گی

آہ! یہ دکھ بھرا نظامِ حیات
جس کے پنجے میں تلملاؤ گی

آہ! یہ طوقِ رسم و راہِ جہاں
جس کو زیبِ گلو بناؤ گی

جس میں جلتا ہے دل سہاگن کا
اس جہنم میں ہنستی جاؤ گی

مان لوں کیا یہ میں کہ آج کی رات   آخری گیت اپنا گاؤں گی
پانی بھرنے کے اک بہانے سے   اپنی گاگر اٹھا کے آؤں گی
آ کے ندی کنارے لہروں کو   دیر سے منتظر سا پاؤں گی
ایک لمحے کے بعد کیا ہوگا   ان کی گودی میں تھرتھراؤں گی
زندگانی کے قید خانے کی   ساری زنجیریں کاٹ جاؤں گی

کاش پہنچے یہی نوید مجھے
ملے اس خط کی یوں رسید مجھے

(۱۷-۳-۱۹۴۰)

کہاں؟

[illegible] اے دوست

[illegible] سہانی ہے

[illegible] روشن ہیں

[illegible] کو پناہ

زندگی [illegible] محبت کا

زندگی ہے تو خوش نصیب ہیں ہم

[illegible]

[illegible] کھیلتی ہیں

[illegible] رہا ہے یہاں

[illegible]

[illegible] ہو جائے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(۱۵-۳-۱۹۴۰)

عقدۂ ہستی

(ریل کے ایک سفر کے زبانی تاثرات)

خشک ندی کے کنارے ریل کی پٹری کے پاس
کھل رہا ہے دشت میں اک لالہ آتش لباس
اس طرف کمھلائی دوب اور اس طرف سوکھا ببول
پل رہا ہے جن کی بے احساس گودی میں یہ پھول
کھیلتا ہے گرچہ انگاروں سے اس کا ہر نفس
مٹ رہا ہے خاروخس میں ہم نشینِ خاروخس
درد کی فطرت کا دم اس طرح گھٹتا دیکھ کر
دیکھ کر اس سوز کی دولت کو لٹتا دیکھ کر
مجھ کو نظمِ زیست کی بربادیاں یاد آ گئیں
میری آنکھوں میں برستی بدلیاں لہرا گئیں
اس پر اک ساتھی نے حیرت سے کہا "کیوں کیا ہوا
او مسافر بھائی تو کیوں رو پڑا؟ کیوں، کیا ہوا؟"

یہ کہتے ہیں حقیقت کو چھپانے کے لئے

ورنہ کیا ہے جینا انسان ہونے کے لئے

مسکراہٹیں سجاتے ہیں ہنسنا "آتی نہیں"

وہی بھیگی بھیگی آنکھیں میری، صدا کی گئیں"

عقدہ ہستی کو سمجھا ہے کس نے اور کب؟

آہ اس دنیا میں دل روتے ہیں اور ہنستے ہیں لب!

مسافر

گزرگاہِ جہاں پر — ہم مسافر!
شکستہ دل، شکستہ دم، مسافر
عجب کچھ زندگانی کا سفر ہے
مسافر کا نہیں محرم مسافر
گلے ملتی ہے رو رو کر گلوں سے
کہ اس گلشن میں ہے شبنم مسافر
کٹھن ہے عشق کی منزل کٹھن ہے
چلے تنہا اس روش پر کم مسافر
ابد اک موڑ تیرے راستے کا
تو سیلِ شوق ہے، مت تھم مسافر!
گلہ کیوں شوخیِٔ قسمت کا امجدؔ؟
کرے کیوں فکرِ بیش و کم مسافر

(۲۷-۱۰-۱۹۳۰)

ساز فقیرانہ

کلی کی ثبات ہے یہ، تمہیں پتہ بھی ہے
تمہی نے خاک میں رنگ سمویا تو سونا کیا

فقیر ہیں، وہ فقیرانہ ساز رکھتے ہیں
ہمارا ہنستا ہے کیا اور ہمارا رونا کیا

ہمیں زمانے کی ان بیکرانیوں سے کام!
زمانہ جس سے ہے، ہم دل کا ایک کونا کیا

نگاہِ دہر کو تیورا کے کس لیے بیٹھیں
جو خود ہی ڈوب رہا ہو اسے ڈبونا کیا

بساطِ سیل پہ قصرِ حباب کی تعمیر
یہ زندگی ہے تو پھر ہونا کیا، نہ ہونا کیا

نہ رو کہ ہیں ترے ہی اشک ماہ و مہر امجد
جبیں پہ دھبّہ شبِ تاریک اگر تو رونا کیا

(۳-۱۲-۱۹۴۰)

سفرِ حیات

ہر اک نقشِ پا کی زباں پر فسانے
ہر اک ڈوب میں مضطرب سو ترانے
ہر اک موڑ پہ اس کے لاکھوں زمانے
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا، نہ جانے؟

کسی بوستانِ حسیں کے کنارے؟
کسی وادیٔ شبنمیں کے دوارے؟
کسی خارزارِ حزیں کے ٹھکانے؟
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا، نہ جانے؟

اُمیدوں پہ حسرت سی برسا رہے ہیں
پس و پیش سے کان میں آ رہے ہیں
بھٹکتے ہوئے قافلوں کے ترانے
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا، نہ جانے؟

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(۱۹۳۰ء)

چکی

آگ سینے آئی جب کوئی پڑوسن شام کو　　یوں چکی نے وا کیا اپنے لب دشنام کو

"اس موئی پاپن نے تو مجھ کو جلا ڈالا بہن!　　کوئی ہو اس بے حیا سے پوچھنے والا بہن

یہ نگوڑی کیوں گلی کے موڑ پر کل پچھلی رات　　کر رہی تھی جانے کیا سرگوشیاں اور اسکے ساتھ"

وہ بیچاری آلوؤں کو چھیلتی بے اختیار　　ہاتھ میں اپنے چبھو بیٹھی چھری کی تیز دھار

صبح کو گونجی فضا میں جب کسی بنسی کی لے　　اسکے سینے میں تڑپ اٹھی کوئی بیتاب شے

ہاتھ سے چلتی ہوئی چکی کا دستہ چھٹ گیا　　اک جہاں اسکے تصور میں بسا اور لٹ گیا

اتنے میں ظالم چکی کی غیظ ناک آواز پر　　جھک گئی پھر سے وہ سنگِ آسیا کے ساز پر

کیوں نہ ہو اس دکھ کی ماری کیلئے جینا وبال　　اک چکی کے ہاتھ میں ہو جسکے گھر کی دیکھ بھال

باپ جس کا کارخانے میں کہیں مزدور ہو　　اپنی اکلوتی جواں بیٹی سے کوسوں دور ہو

جس کی ماں پھر لوٹ کر فردوس سے آئی نہ ہو

وہ ابھاگن! جس بیچاری کا کوئی بھائی نہ ہو

(۱۹۴۰ء)

ملاقات

تم کو شہروں نے پکارا سبزہ زاروں نے مجھے — تم کو پھولوں نے صدا دی اور خاروں نے مجھے

میں انہی پگڈنڈیوں پر بانسری چھیڑا کیا — بے ارادہ جانے کس کا راستہ دیکھا کیا

جب ندی پر تھرتھراتا شام کی سندور کا رنگ — میرے دل میں کانپ اٹھتی کوئی ان بوجھی امنگ

جب کھنڈری برہمنوں کی آرتن میں ناچتی — کوئی بے نام آرزو سی میرے من میں ناچتی

ریت کے ٹیلے پہ سرکنڈوں کی لہراتی قطار — نیم شب میں دور میری بانسری اور انتظار

آہ یہ سرسبز میداں، دم بخود، لاانتہا — جن کی وسعت میں جوانی میری آوارہ رہی

بعد مدت کے تمہارا آج ادھر آنا ہوا — وہ زمانہ بچپنے کا، آہ! افسانہ ہوا

کتنے سجتے ہیں یہ ریشمی زرد و نازک آستیں — ہنس رہے ہو؟ کہ تمہارا قہقہہ بدلا نہیں

مجھ کو دیکھو میں ابھی وابستہ آغاز ہوں — ان حسیں ویرانوں میں گوش بر آواز ہوں

دوڑتی جاتی ہے دنیا وقت کے محمل کے ساتھ — میرے حصے میں وہی مہتاب، بن، بیخواب رات

ڈھونڈتا ہوں گم ہوئی ہے میری دنیائے حسیں — ہاں انہی پچھلے بیابانوں کے پیچھے میں کہیں!

ایک دن جب میرے مرنے کی خبر پائے گی وہ
میری تربت پر تو آئے گی، ضرور آئے گی وہ

(۱۹۳۱ء)

راجا پرجا

رانجے کا کل آج!
سارا جہاں محتاج
تخت، دھن، باج، خراج
گدی، مسند، تاج
تیس برس کا راج
اور پھر اس کے بعد
اک روضہ ویراں

پرجا کا آج نہ کل
شاخ نہ پھول، نہ پھل
بجھے دل کا دل
بھوکا، پیاسا، شل
لاکھ برس کا پل
اور پھر اس کے بعد
مٹی، گورستاں

راجا، پرجا، سب
اک بہت طوفاں
کوہِ عظیم، میداں
کالے سب ساون
جھونپڑیاں، ایواں
نقش اور نقوش
ہر شے اس میں رواں
ہر شے اس میں نہاں
اور پھر اس کے بعد
ایک نئی طوفاں

(۵-۳-۱۹۶۳)

کون؟

چندنی کی پریت کے بجتے گھنگھروؤں سے کھیلے
ریشم کی نرمیں اٹھی کی سرخ البیلی ڈوری
نازک نازک پاؤں بہتے کو ٹھکراتے جائیں
چھم چھمتی جب چل کر ناچتی جائے ڈوری،
باہے شہری تے کی گلکاری والی چپی
جس سے جھکے مست سہاگن مہندی چوری چوری
جانے کتنی سندر ہوگی روپ نگر کی رانی
کہ چپکے سے سطوتی سمٹی انکھیاں گوری گوری
جھنکاروں کی خوشبو ورزوں میں نور اٹھاتی جائے
مجھ جیسوں سے ہارے کی قسمت گوری کی دوری،

(۲۰-۲-۹۳۴)

صبح و شام

تجھ کو خبر ہے کتنی صبحیں
کتنی صبحیں بن گئیں شامیں
آرزوؤں سے مہکی صبحیں
ان کے پرانی بیتی شامیں
ڈوب رہی ہیں ڈوب چکی ہیں
وقت کے طوفانی دریا میں
کتنی صبحیں کتنی شامیں

اب بھی رواں ہے ناؤ میری
اب بھی رواں ہے دھیرے دھیرے
دور ہے امیدوں کا کنارا
دور ہیں ارمانوں کے جزیرے
دور، افق سے دور، وہ دنیا
جس کی فضا میں جھومتی صبحیں
نوریں صبحیں، رنگیں شامیں

ان صبحوں کو ان شاموں کو
کون مری دنیا میں لائے
ہائے میری دکھیا دنیا
جس کے اجالے بھی ہیں سائے
وہ سائے جن کی قسمت کو
سب بیٹھی ہیں اپنی گھاتیں
میری صبحیں میری شامیں

غزل

کیا گریباں چاکِ صبح اور کیا پریشاں زلفِ شام
وقت کی ابتکی زنجیر کی کڑیاں تمام

دیکھیے تنکے کی ناؤ کب کنارے جا لگے
موج ہے وحشت خروش اور سیل ہے وحشت خرام

شوق کے دامن میں شعلہ، شوق کے قدموں میں راہ
اور ہو جاتا ہے ہر منزل پہ پروانے کا نام

زیست کی صہبا کی رو تھمتی نہیں، تھمتی نہیں،
ٹوٹتے رہتے ہیں شیشے، چھوٹتے رہتے ہیں جام

(۱۹۴۳ء)

ارتھی

تو نے کیا دیکھا؟ تو نے کیا سمجھا؟
جب تری زندگی نواز آنکھیں
گوشۂ بام کی بلندی سے
فرطِ حیرت سے، دردمندی سے
جھک پڑیں اس ہجوم راہ پہ
جو گزرتا تھا تیرے کوچے سے
ایک ارتھی اٹھائے شانوں پہ

چند تنکے سے پھول اور اک چادر
زندگی کی بہار کا انجام؟
ہستی کی آخری منجدھار؟
تیرے حسن اور میرے جنوں کا مآل؟
اک حسیں تھا کہ صرف خیال؟
میں نے دیکھا تو سوگواری تھی
تو نے کیا سوچا؟ تو نے کیا سمجھا؟

حسینؓ

وہ شامِ صبحِ دو عالم تھی جب بہ سرحدِ شام
رُکا تھا آکے ترا قافلہ، ترے خیّام،
متاعِ کون و مکاں، تجھ شہید کا سجدہ
زمینِ کرب و بلا کے نمازیوں کے امام
یہ نکتہ تو نے بتایا جہاں والوں کو!
کہ ہے فرات کے ساحل سے سلسبیل کا کام
سوارِ مرکبِ دوشِ رسولؐ — پورِ بتولؑ
چراغِ محفلِ ایماں ترا مقدّس نام!

(۱۳-۱-۱۹۴۴)

ہزاروں راستے ہیں

ہزاروں راستے ہیں منزلیں ہیں
سمندر اور صحرا بھی ہیں حائل
مگر روشن ستارے کی شعاعیں
ہیں جو [illegible] سینے کی متاعیں
جو اک شب [illegible] کشتی سے گزرا
[illegible]

تمھاری تو مری منزل الگ ہے
تمھارے دل سے میرا دل الگ ہے
سمندر اور صحرا ان میں حائل
کسے معلوم کب یہ دو مسافر
کبھی اک دوسرے سے مل سکیں گے
کبھی شاید یہ غنچے کھل سکیں گے

مگر دونوں کا رہبر ہے وہ تارا
جو اِک دن میرے حرفِ آرزو پر

تمہاری انکھڑیوں سے گر پڑا تھا
جبینِ وقت پر تاباں ہُوا تھا

شب و روز آئے اس کے بعد لاکھوں
ابھی تک اس کی کرنوں کے اشارے

صدا بھٹکے ہوؤں کو دے رہے ہیں
ہماری کشتیوں کو کھے رہے ہیں

ہمارے راستے کتنے الگ ہوں
ہماری منزلیں کتنی جدا ہوں

مگر رہبر ستارا تو وہی ہے
امیدوں کا کنارا تو وہی ہے

(۱۸-۱-۱۹۴۳)

نعتیہ مثنوی

شہر مکہ بتوں کی بستی ہے — چادرِ تیرگی برستی ہے
لو وہ اِک نور کی کرن پھوٹی — بزمِ آفاق جگمگا اٹھی
دیکھنا اک یتیم بے ساماں — بے نوا، کم سخن، تہی داماں
جس نے یوں سال و سن گزارے ہیں — بھوک میں اپنے دن گزارے ہیں
پیرہن تن پہ تار تار اس کا — کوئی محرم نہ دوستدار اس کا
تپتی ریتوں پہ محوِ خواب کہیں — تیز کانٹوں سے زخم یاب کہیں
چلتی تیغوں کے درمیان کبھی — کنکروں سے لہولہان کبھی
ذرہ ذرہ عدوئے جاں اس کا — تشنہ خوں ہے اک جہاں اس کا
ہاں مگر لب جب اُس کے ہلتے ہیں — دل کے مرجھائے پھول کھلتے ہیں
جب وہ پیغامِ حق سناتا ہے — وجد میں دو جہاں کو لاتا ہے
جب وہ اُونچی صدا سے کہتا ہے — بادیانہ ادا سے کہتا ہے
گمرہو! تم یہ کیا سمجھتے ہو — پتھروں کو خدا سمجھتے ہو
دل دہلتے ہیں قہرمانوں کے — دیئے بجھتے ہیں کفرخانوں کے
بات یہ کیا زبان سے نکلی — لاکھ تلوار میان سے نکلی
ظالموں کی اذیتیں اِک سمت — اور خدا کی مشیتیں اک سمت

دیکھیے تیز دھوپ کی لو میں
آندھیوں کی شراروں رو میں

مکے سے دور اور مدینے سے پاس
جا رہا ہے کوئی بہشت نشاں

جا رہا ہے وہ کوئی راہ نورد
وہ جہاں اسکی پاک پلکوں کی گرد

سانڈنی پر سوار جاتا ہے
درمیانِ غبار جاتا ہے

ساتھ اک صدقِ جاں رواں ہے
عشق کا کارواں رواں ہے

ہر گھڑی کچھ اور منظر ہے
مرتضیٰ ہے نبیؐ کا بستر ہے

شب ہے اندھیرا گہرا گہرا ہے
چار سو قاتلوں کا پہرا ہے

وہ پیمبر کی چارپائی پر
خفتہ ہے بے جھجک خدائی پر

سوئے یثرب نبیؐ کی بات اٹھی
کفر کے خرمنوں سے آگ اٹھی

روئے صحرا کے ٹیلے ٹیلے پر
آج قدغن ہے ہر قبیلے پر

اس طرف سے رسولؐ اگر گزرے
تو وہ کٹوا کے اپنا سر گزرے

آہ وہ راستہ بیاباں کا
خطِ نوری جبینِ ایماں کا

اس کی پاکیزہ خاک کیا کہنا !
خاک اور تابناک کیا کہنا !

جس کے ذروں کو رشکِ ماہِ تمام
کر گیا ناقۂ نبیؐ کا خرام

نقشِ پا دے کے جس کے سینے کو
میرا آقا گیا مدینے کو

کاش وہ خاک مجھ کو مل جائے
سرمۂ پاک مجھ کو مل جائے

میں اسے روکرا کے تل میں ||| [illegible] ہیں دیدہ ور میں
جذبہ کامل چھپا ہے ذات میں ||| بندگی سے سیاد خانے میں

جو نبی کے قریب ہیں وہ لوگ ||| کس قدر خوش نصیب ہیں وہ لوگ
انکے قدموں کے ساتھ رہتے ہیں ||| اس کی موجوں کے ساتھ بہتے ہیں
انکے ابرو کے ہر اشارے پہ ||| تیرتے ہیں لہو کے دھارے پہ
انکی عزت پہ سر کٹاتے ہیں ||| آخری وقت مسکراتے ہیں
انکے قدموں میں موت کو ڈھونڈیں ||| انکا ایک ایک سانس ہے روشن
ہاں وہ دیکھو بلال کی حالت ||| چور زخموں سے خون میں لت پت
گرم ریتی پہ تلملاتا ہے ||| تازیانوں کی چوٹ کھاتا ہے
موت کا خوف ہے نہ زیست کی فکر ||| اس کے ہونٹوں پہ لا الہ کا ذکر

دیکھنا جنگ احد کی جاری ہے ||| وقت اسلامیوں پہ بھاری ہے
چارسو کافروں کا ریلا ہے ||| ابن سکن زیاد اکیلا ہے
اس نے دیکھا کہ چند بد گہر ||| وار کرتے ہیں جو محمد پر
دوڑ کر آ کے درمیانِ نبی ||| جان دے کر بچائی جانِ نبی
لاش اس کی اٹھا کے لاتے ہیں ||| سامنے مصطفیٰ کے لاتے ہیں

ابھی کچھ اس میں ہوش باقی ہے   اک نفس کا خروش باقی ہے
دم آخر کے وقت مشکل میں   ابھی کچھ آرزو سی ہے دل میں
اپنے سینے کے بل گھسٹتا ہے   پائے محبوبؐ سے چمٹتا ہے
اُن کے قدموں کو چوم لیتا ہے   مسکراتا ہے جان دیتا ہے
آہ یہ رتبۂ فدائے نبیؐ   آخری سانس اور یہ پائے نبیؐ
آہ یہ شمعِ حق کے پروانے   درجِ انسانیت کے دُردانے
کیا محبت ہے کیا ارادت ہے   موت ان کیلئے عبادت ہے

جنگِ موتہ کا اک سماں دیکھو   زیدؓ کے ہاتھ میں نشاں دیکھو
زیدؓ وہ اک غلام پاک نہاد   جس کو اسلام نے کیا آزاد
جب نبیؐ کی اسے غلامی ملی   دونوں عالم میں شادکامی ملی
ہر گھڑی راحتوں میں صدموں میں   ہے وہ شاہِ عرب کے قدموں میں
یہ ہے رنگِ اُخوتِ اسلام   آج سردارِ فوج ہے وہ غلام
وہ جری تین سو سپاہ کے ساتھ   لڑتا ہے فوجِ بے پناہ کے ساتھ
ہو محبت رسولؐ سے جس کو   لائے خاطر میں وہ بھلا کس کو
اس کی ہمت کو کون ٹوک سکے   اس کے طوفاں کو کون روک سکے
ہیں رواں زندگی کے ہنگامے   تسمہ اس کی رکاب کا تھامے

جو بچھڑا اس محفلِ حیات میں سے — اسکی بات اسکے باپ بات میں ہے

موت اس پیٹ سے شیریں جام — آخری گھونٹ اور عمر دوام

آ رہی ہے وہ فتحیاب سپہ — بن زید شہیدؓ کے ہمراہ

پُر مسرّت نہیں ہے شہر میں — صفِ ماتم بچھی ہے گھر گھر میں

وہ گہرِ آب نہیں خزینے میں — ایک کہرام ہے مدینے میں

آب گوں دیدۂ پیمبرؐ ہے — مرنے والے کا کیا مقدر ہے

اسکے زخموں کا خون چہرے کی دھول — پا رہی ہے نبیؐ کی آنکھ سے پھول

وہ عدم کی طرف روانہ ہے — ساتھ یہ بے بہا خزانہ ہے

اس کی بچی کو دیکھ کر رنجور — اسکے اشکوں کو چومتے ہیں حضورؐ

باپ کا صدمہ کیا پڑا اُس پر — جھک پڑی رحمتِ خدا اُس پر

رحمتِ دو جہاں کے سائے میں — فرق کیا اپنے اور پرائے میں

جس کے سر پر نبیؐ کا سایہ ہے — اسکی دُنیا ہے اس کی مایا ہے

اس کا جینا ہے اس کا مرنا ہے — ڈوب کر بھی اُسے اُبھرنا ہے

ایک منزل ہے اس کے ایماں کی — سربلندی مقام انساں کی

لو لگا کر خُدا کی ہستی سے — آدمی کو اُٹھانا پستی سے

روح میں شورشیں زمانوں کی — سانس میں کروٹیں جہانوں کی

دل میں سامان سو اُجالے کا — ہاتھ میں پلو کملی والے کا

(۲۶-۳-۱۹۴۳)

زندانی

دردوں کے مارے دو قیدی !
زنجیروں کی چھنکاروں میں
اک غم گیں سا ' اک حیراں سی
کالی کالی کوٹھڑیوں میں
دونوں کی نظروں پہ پہرے
ہونٹوں پہ مہریں چسپاں سی
لاکھوں آرزوئیں ' اُمیدیں
دوزخ کے ناگوں کی صورت
سینوں میں غلطاں غلطاں سی
سہمے سہمے سے قدموں کی
آہٹ کان میں آجاتی ہے
آہٹ ! مدھم سی ' بے جاں سی
تو اک چرخے کی گھوں گھوں میں
گُم سی ہو کر رہ جاتی ہے
خوف زدہ ' پُرمعنی کہانی
پھر وہی جلادوں کی نگاہیں
پھر وہی سنگینوں کی نوکیں
پھر وہی خنجر ' پھر وہی پھانسی

(۱۱-۵-۱۹۴۳)

ریڈنگ روم

میز پہ اخبار کے چھپے ورق
بکھرے بکھرے تیرہ و چپ چاک
دفن کی ہے قالبِ الفاظ میں
سینۂ ہستی کی آہِ دردناک
پاس کی دیوار کو ٹیکے ہوئے
ریڈیو گرمِ سخن، گو بیاں
چیختی ہیں جامد آواز میں
خون کے چھینٹے، لہو کی بوندیاں

شامِ ریڈنگ روم کی مغموم شام
چند کان، اطلاچی کی بات پہ
چند آنکھیں، سوچ میں ڈوبی ہوئیں
مرتکز، اخبار کے صفحات پہ
ایک کمرے میں سمٹ کر آگئے
کتنے دھڑوں کے صدا پیکر حروف

کتنے دردوں کے مسخر زمزمے
کتنے اندھے گیانی، بہرے فیلسوف!

پھر بھی کچھ ادراک میں آتا نہیں
کیا ہے رقصِ گردشِ ایام، کیا!
اک شکستہ ناؤ اک خونی بھنور
کیا ہے اس افسانے کا انجام، کیا؟
یہ مگر کچھ سمجھ سکتے نہیں!

چھت کے نیچے، روزنوں کے درمیاں
گول گول آنکھوں کے اندر محو دید
کالے پارے کی مرقص پتلیاں

کاش یہ حیراں کبوتر جانتے
خفتہ ہے ان کاغذوں کی سطح پر
کتنے چکنے آشیانوں کا دھواں
کتنے نخچیروں کی آہوں کے شرر
ہیں ان آوازوں کے اندر پرکشش

کتے، گدھ، جن و مرداروں کی بو

کھیتی اُگی ہے سرِ دیوار ہر سُو ۔

چھت کے نیچے مضطرب، نظارہ جُو

فرزند آنکھوں میں حیراں پتلیاں

یہ کبوتر ، دیکھتے تھکتے نہیں

دیکھتے ہیں — سوچتے ہیں — کیا کریں —

یہ مگر کچھ کہہ سکتے نہیں ۔

۱۰|۱۰|۱۹۴۴)

لاہور میں

ڈاک خانے سے ٹکٹ گھر پر خریداروں کی بھیڑ؛
ایک چوبی صندوق پہ چوڑی دواتیں — اک قلم
یہ قلم میں نے اُٹھایا اور خط لکھنے لگا —
"پیارے ماموں جی!
"دعا کیجے — خدا — رحم — سے — مجرم
"آج انٹرویو ہے! — کل تک فیصلہ ہو جائے گا
"دیکھیں کیا ہو؟ مجھ کو ڈر ہے"
اتنے میں تم آ گئیں!
"آپ ذرا تکلیف فرما کر پتہ لکھ دیجیے"
میں نے تم سے وہ لفافہ لے لیا، جھجکا نہیں
"بے دھڑک" لکھ ڈالا میں نے "کانپتے ہاتھوں" گیا تھا
مختصر سا ہی پتہ "کلکتے میں ... [illegible] کے نام"
"شکریہ" — "جی کیا؟" — اک ہنسی تھی زیرِ لب
ڈاک میں خط — تم گئیں رو کر — قصہ تمام!

(۱۳-۳-۱۹۴۴)

غزل

آ، سازِ گلستاں کو بہ مضرابِ خار چھیڑ
مطرب، کوئی ترانۂ بیادِ بہار چھیڑ

سوئے ہوئے سکوتِ چمن کو ذرا جگا،
پھر تو — نواطرازِ غمِ روزگار — چھیڑ

کل یہ جگہ تھی وادیٔ نکہت، رباب اُٹھا
کل یہیں ہجومِ گل تھا، سرودِ بہار چھیڑ

قصہ کوئی بہ ماتمِ جام و سبو سنا
نغمہ کوئی بہ تعزیتِ سبزہ زار چھیڑ

کچھ بھی نہ ہو خزاں تو ہے اک راگنی الاپ
ہر خس ہے ایک سازِ نوا، در کنار چھیڑ

شاید پلٹ کے آ سکے اب بہار، گا
پژمردہ شاخسار پہ جھک کر ستار چھیڑ

(۱۱-۱۹۴۴)

قبلا خاں

زناڈو میں قبلا خاں نے رنگ محل بنوائے

زرّیں اس دیوانی ندی پہ جس کی مقدس موجیں

گہری اور اتھاہ دراڑوں سے سینوں کو ڈستی

گھور اندھیروں کے ساگر میں بسالیں اپنی بستی

دور دور تک سونا اگلتی دھرتی کا پھیلاؤ

جس کے چاروں اور فصیلیں، گنبد اور منارے

باغ — جو بہشتی آب رواں کے چھینٹے سے چمکیں

بوجھل بوجھل خوشبوؤں سے لدے پھندے اشجار

بوڑھے جنگل — جیسے پرانے پہاڑوں کے ہمزاد

کہیں کہیں جن کی وسعت میں

دھوپ میں لپٹے سبزہ زار

اوہ! وہ دیکھو

گھنے گھنیرے پیڑوں کے اس پار

سبز چٹانوں کے سینوں میں گہرے بھیانک غار

ہیبت ناک مقام

رچی بسی پاکیزگیوں کا ایک فسونِ دوام

جیسے ڈھلتے چاند کی پیلی چھایا میں گھل جائیں
بربادی کی آگ میں جل مٹنے والی اک دیوداسی کی پرچھائیں
یہی وہ غار یہی وہ گھاؤ
جس کی تہہ سے اُچھلے کھولے
ایک اُبلتے چشمے کی ان تھک آوازوں کا وہ الاؤ
جو دھرتی کی بانجھ چھاتی میں بے کل سانسوں کی مانند
تڑپے اور تڑپتا جائے
جس سے جھم جھم برسیں
جلتی چٹانوں کے سیال انگارے
جیسے تپتے توے پر بھنتے دانوں کی کلپاہٹ
انہی اُچھلتی چٹانوں کے جھرمٹ سے اُبھر کر ڈوبے
وہی مقدس دریا جس کی موجیں
گہری اور راتق دروازوں کے سینوں کو ڈستی
گھور اندھیروں کے ساگر میں بسا لیں اپنی بستی
یہی ہے وہ ہنگامہ صوت سنگ و فروش دریا
جس کے روپ میں قبلا خاں کے کانوں سے ٹکرائیں
گزرے بلوانوں کی صدائیں
جنگ کے نقارے کی دھم دھم

(۹، ۱۹۳۳)

ایک دُعا

(جسے درجۂ قبولیت نصیب ہوا)

خلاقِ دو جہاں! مری آنکھوں کو نور دے
چھینی ہوئی یہ دولتِ کیف و سرور دے
پھر قوتِ نظارۂ دشت و دیار بخش!
پھر طاقتِ مشاہدۂ نزد و دور دے
مجھ پہ پھر سے سمع ”تبصر“ کر
مجھ کو نوید لطفِ خدائے غفور دے
اللہ! مجھ کو دیدۂ بینندہ کر عطا
مولا! تو ہی دوائے دلِ ناصبور دے
پھر سونپ میری آنکھوں کو آنکھوں کی روشنی
یہ میری چیز پھر مجھے دے اور ضرور دے

(۲۲-۱۲-۱۹۳۶)

غزل

ضمیرِ رازداں ہے اور میں ہوں
جہاں اندر جہاں ہے اور میں ہوں

درِ پیرِ مغاں ہے اور میں ہوں
وہی رطلِ گراں ہے اور میں ہوں

وہی دورِ زماں ہے اور میں ہوں
وہی رسمِ فغاں ہے اور میں ہوں

فریبِ رنگ و بو ہے اور تم ہو
بہارِ صد خزاں ہے اور میں ہوں

جہاں ہے ــــ اور سکوتِ نیم شب ہے
مرا قلبِ تپاں ہے اور میں ہوں

یہ وہ ساتھی نہ جانے کب بچھڑ جائیں
مری عمرِ رواں ہے اور میں ہوں

(۴-۳-۱۹۵۰)

غزل

چمن چمن میں ہے طغیانِ رنگِ لالہ پھرو
ختن ختن میں ہے انبوہِ صد غزالہ پھرو

سجا کے ہونٹوں پہ اک جشنِ زہرخند چلو
چھپ کے سینے میں صد موجِ آہ و نالہ پھرو

روش روش پہ بچھی ہے سیاہیوں کی بساط
پلک پلک پہ جلا کر چراغِ لالہ پھرو

چکیدِ اشکِ فراواں سے ہے کشیدِ شراب
جہانِ قیصر و جم میں تہی پیالہ پھرو

کنارِ دل سے گزرتی اُداس راہوں پہ
ہر ایک سانس ہے عمرِ ہزار سالہ پھرو

(۱۹۵۰ء)

مشرق و مغرب

نہ خوابِ مشرق
نہ سحرِ مغرب
بس اک چمکتی گداز مٹی
کی چادرِ سبز جس کے دامن
میں کل تھے انبار گندم و جو
اور آج انبار سیم و آہن

یہ کون سمجھے
یہ کون جانے
کہ اس تڑپتے ہوئے زمانے
کے سائے میں ڈولتی سی شمعوں
کی روشنی، جو پیالۂ گل
صراحیٔ سنگ، کوزۂ مس
کو پھاند کر شہر و دشت و ساحل
سے اٹھتے گرز و سنان و خنجر

پہ جم گئی تھی — وہ کانچ کی لو
جو آج بھی حلقِ زندگی پہ
شکستہ رگ ہے، اسی کا پرتو
جبینِ نو سے فروغِ ممنوں
میں ڈھل گیا ہے
عجیب قصہ ہے ضربِ خارا
سے ذہنِ فولاد جل اٹھا ہے

نہ کوئی مشرق
نہ کوئی مغرب
مگر وہ اک نسخۂ مراتب
جو ان گنت بے زباں غلاموں
کی ٹوٹتی پسلیوں پہ کل بھی
ہزار کف در دہاں خداؤں
کے بوجھ سے کچکچا رہا تھا
اور آج بھی اک وہی ترازو
کہ جس میں زنجیر پوش روحوں
کے شعلہ اندام دست و بازو

جو یوں یہ اشک ڈھل رہے ہیں
اگر یہی تھا نصیبِ دوراں
یہ نالۂ غم، یہ اک مسلسل
خروشِ انبوہِ پابجولاں
ازل کی سرحد سے نسلِ آدم
کی یہ کراہیں جو روز و شب کے
عمیق سناٹے سے پیہم
اُبھر رہی ہیں یہ چشم و لب کے
فسانہ ہائے سرشک و شیون
اگر مقدر یہی تھا اپنا
تو یہ مقدر یقین جانو اٹل نہیں تھا

یہی ہے مشرق
یہی ہے مغرب

وہ پارہ ہائے سفال و خارا
وہ عقلِ حیراں کی کارگاہیں
وہ جنسِ نایاب، کل ہمارے
جہانِ صد ریزۂ خزف میں

ہماری دولت تھے، ہم خدا تھے
اور آج بھی یہ شرار پیہم
حقیقتوں سے طلسم سوزاں
یہ وسعتِ بحر و بر میں غلطاں
ضمیرِ آدم کی جیتی سانسیں
یہ ذرّے ذرّے کے قلبِ تپاں
میں کھولتی قوتوں کے طوفاں
زمانہ ہے جن کی رو میں تنکا
جو آج بھی ہو وجود ان کا
ہماری مٹھی میں، ہم خدا ہیں
سیاہیوں کے چھٹتے تُم سے
اُبھرتی کرنوں کا حوصلہ ہیں

(۱۲-۳-۱۹۵۱)

ایک شام

ندی کے لرزتے ہوئے پانیوں پر
تھرکتی ہوئی شوخ کرنوں نے چنگاریاں گھول دی ہیں
تھکی دھوپ نے آ کے لہروں کی پھیلی ہوئی ننگی باہوں پہ اپنی لٹیں کھول دی ہیں'

یہ جوئے رواں ہے
کہ بہتے ہوئے پھول ہیں جن کی خوشبو میں گیتوں کی سسکاریاں ہیں
یہ پگھلے ہوئے زرد تانبے کی چادر پہ اُلجھی ہوئی سلوٹیں ہیں
کہ زنجیر ہائے رواں ہیں!

بس اک شورِ طوفاں!
کنارا نہ ساحل'
نگاہوں کی حد تک
سلاسل! سلاسل!
کہ جن کو اٹھائے ہوئے ڈولتی پنکھڑیوں کے سفینے بہے جا رہے ہیں
بہے جا رہے ہیں
کہیں دور ان گھور اندھیروں میں جو فاصلوں کی ردائیں لپیٹے کھڑے ہیں
جہاں پر ابد کا کنارا ہے — اور اک وہ گاؤں،
وہ گنّے کے کیاروں پہ آتی ہوئی ڈاک گاڑی کے بھورے دھوئیں کی جھلملاتی سی چھاؤں!

(۱۲-۱۹۵۱)

منزل

اس ایک بات سے انکار ہو نہیں سکتا
کہ ہم نے اپنے لہو سے، بساطِ عالم پر
لکیر کھینچی ہے جس سلطنت کی، اس کا وجود
ہے ایشیا کے شبستاں میں، صبحِ نو کی نمود!

یہ سب بجا ہے، کہ ہم جن جگر کے ٹکڑوں کو
بہ شہر و قریہ، بہ دشت و چمن، بہ کوچہ و بام
بھڑکتی آگ میں بہتے لہو میں چھوڑ آئے
وہ روحیں، جن کے سیہ پوش، ماتمی سائے
ہمارے جلتے ہوئے پیکروں سے لپٹے ہیں
وہ قافلے، کہ جنہیں مہلتِ سفر نہ ملی
انہی کے سڑتے ہوئے لوتھڑوں کی ہونکتی بو
انہی کی ڈوبتی فریادیں، چیختے آنسو
ہمارے محلوں کے نغمے، ہمارے باغوں کے پھول!

یہ پھول، یہ نغمے، یہ تبسم کے ہجوم
جو حسن کو اور مشکبو کر نہ سکے
نفس جاں کو امتزاج پیار کر نہ سکے
وہ جن کے واسطے یہ گلستاں سجایا گیا
گراں طرح تری داد، تری سعد ہی رہے
تو سوچ لو کہ یہ نازک، لطیف پرتو نور
یہ زہرناک ہواؤں میں ٹھہرا غرور
ہزار ساعت بے برگ کے بیاباں میں
ہے اک امنگوں بھری سانس!

اس کا مستقبل؟

ہماری زندگیوں سے اک اک تڑپ لے کر
بچے ہیں جو فلک نے، بہ سلک شام و سحر
گلوئے غم کے لئے، چہ طرب کے لئے
صدا بہار ارادوں سے ہار

ان کا مآل؟

یہی سوال ہے راز غم زمان و زمیں،
حضور، ان کا یقین پرکھنے جواب نہیں

دھوپ چھاؤں

بہتی ندیاں
کھوتے جاتے ہیں
اجلی دھوپ
ان سے بھی آگے دور کہیں وہ دنیا
جس کا روپ
آنے والے مست دنوں کے ہونٹوں پر مسکان،
سمے سمے کا دھیان !

بھیگی بھیگی چاندنیاں
اور کجلی کجلی دھوپ
جن کی اڑتی راکھ میں جھلکے بیتے دنوں کا روپ
ساتوں کی گھمر گھمر میں ڈوبتا ڈوبتا گیت
سمے سمے کی ریت

من کی یہ چنچل لہریں، ان کا کوئی نہ ٹھور مقام
دن گزرے تو صبح سویرا، رات کٹے تو شام
ساون ساون، جلتے جھونکے
پلک پلک، برسات
سمے سمے کی بات

(۱۴-۱۹۵۱)

اکھیاں کیوں مسکائیں

کون بتائے روپ نگر کی سکھیاں اکھیاں کیوں مسکائیں،
دل کے راگ محل کی تانیں،
سندیسوں کے دیس سے ہو کے
پائل کی جھنکار کو رو کے
جب ہونٹوں کے دروازوں پر چھپ چھپ آئیں ٹھٹک جائیں
اکھیاں کیوں مسکائیں

چھند کے سناٹوں کے جزیرے
مہر بلب سانسوں کے بیاباں
آن بسیں جب رقصاں رقصاں
اک لمحے کے رین بسیرے میں ارمانوں کی پرچھائیں
اکھیاں کیوں مسکائیں

گھونگھٹ کھولے، نہ منہ سے بولے

من کی بانی، چنچل رانی،

جب یہ کہانی، دور انجانی

دنیاؤں سے گزرے بن کر دھیمی بانسریوں کی صدائیں

انکھیاں کیوں مسکائیں

(۸-۱۲-۱۹۵۲)

ایک خیال

تمھارے ہونٹ وہ ٹھنڈے سے ریزہ ہائے نبات
مرے لبوں سے ملے جھجکتی جھجکتی پچوں سے سات
تو جھونکے جھونکے میں بھرتی شمیم حیات

کسے خبر، کہ پگھلتا ہوا وہ جسم حسیں
مری بچی ہوئی پھولوں کی دولت رنگیں
اب اس کی خاک بھی خاک حد میں ہے کہ نہیں

تمھاری گرم کفن اور ہجوم گرگ کور
مصاحبان اجل، گنگ و پابریدہ و کور
بس ایک میری نوائیں، تمھاری روح کا شور

میں زندہ ہوں تو مری زندگی تمھاری حیات
ورنہ یوں تو ہے کس کو دوام، کس کو ثبات
نفس نفس، سر ظلمت، پرتو ظلمات

(۸۔ ۲۔ ۱۹۵۳)

جیون دیس

مجھے یقیں تھا

میں جانتا تھا

کہ اس اندھیرے گھنیرے جنگل میں جس کے شانوں

پہ تیرتے بادلوں کے سائے ــــ سیاہ گیسو

بکھر گئے ہیں ضرور کرنوں لدے جہانوں

کا کوئی پرتو، ڈھلی ڈھلی دھوپ کا تبسم

کہیں درختوں کے مخملیں سبز سائبانوں

سے چھن کے اس نغمہ ریز ندی پہ جھلک اُٹھے گا

جو آنکھ او جھل مسرتوں کے حسین ٹھکانوں

کی اوٹ سے پھوٹتے اُجالوں میں بہہ رہی ہے

مرے خیالوں میں بہہ رہی ہے!

یہ ان جانے

یہ ن مجھے

جب بھی اس گھومتی زمیں پر کسی سہانے

ے ن دامن میں اٹھی ہیں تری ہوئی نگاہیں

تہ ذرے ذرے میں زندگی کے نگار خانے

ن جگمگاتی ہوئی شگفتہ جبیں سما گئی ہیں

ن خاموشیوں میں ڈوبے ہوئے ترانے

زندگی کے سینے سے موج بن کر گزر گئے ہیں

مرے خیالوں میں بھر گئے ہیں

(۱۹۵۳ء)

نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب

کیا کہوں، کتنے غموں، کتنے غموں کی شکن آلود بساط
وقت کے ٹوٹتے زینوں پہ مرے رُکتے ہوئے قدموں کے سات
کس طرح بچھتی چلی ہی چلی آئی ہے
کیا بتاؤں یہ کہانی بڑی طولانی ہے

یہ مرا قصۂ غم کون سنے؟ کس کو سناؤں — کس کو
اپنے احساس کا وہ جلتا ہوا زہر پلاؤں — جس کو
پیتے پیتے مری اک عمر کٹی ہے اک عمر
دیکھتے ہو وہ جو اک جادۂ ویرانی ہے

وہ جو اک موڑ ہے اور وہ جو جھروکا ہے سرِ بامِ بلند
کبھی پہنچی نہیں جس تک سحر و شام کے سایوں کی کمند
وہ جو جھکتی ہوئی مرتی ہوئی دیواریں ہیں
جن کا منصب ابھی گلیوں کی نگہبانی ہے

وہ جو ہر شام انہی گلیوں میں کوئی مست سی لے
بند ہوتے ہوئے دروازوں کے آہنگ میں کھو جاتی ہے
وہ خموشی سفرِ شب کے تسلسل کی نقیب
نئی میت پہ اندھیروں سے رلا جاتی ہے
میں نے اک عمر انہی معمورۂ ظلمات میں رقصاں و دواں
ہر قدم اپنے ہی قدموں کی صداؤں سے گریزاں، لرزاں
در و بام سے چھپتے ہوئے گوشوں میں کہیں
دیکھ ان راہوں کی وہ خاک بسر چھانی ہے
کس طرح ایک سہارے کی تمنا میں کسی ٹوٹتے تارے کی حیات
دو گھڑی منزلوں کی طرف اپنے بڑھاتے ہوئے ہات
ہم افق سے ٹکرا کے مجسم ہو جائے
(ان خلاؤں میں کسے تاب پریشانی ہے!)

اب نئی گلیوں پہ اسکولوں کے دبے سے گرتے ہوئے طوفانوں میں
منتظر تھا کہ اچانک کہیں باغوں میں، بیابانوں میں
کھل کے بن جائے کسی نغمۂ شیریں کی بہار،
یہ مرے گرد جو پھیلی ہوئی ویرانی ہے

اب یہاں ریزۂ صد ساغرِ بشکستہ سے کلیاں پھوٹیں
تم نہیں جانتے کلیاں نہیں جیتیں مرے گلزاروں میں

مجھ کو یہ غم ہے وہ اک لحظۂ نایاب کہ جو
حاصل سلطنتِ عالمِ امکانی ہے
جب مری زیست سے ٹکرا کے بھسم ہو بھی گیا تب مجھے معلوم ہُوا
تب میں سمجھا ' کہ یہ راہیں ' یہ گھروندے ' یہ چھلکتی دنیا
اب یہ سب کچھ غمِ جاوید کی اک دھڑکن ہے
اب یہی زخم ہیں اور شغلِ مگس رانی ہے

آج بھی جب کہیں رستے میں ' کسی موڑ ' کسی منزل پر
کسی دیوار سے کنکر بھی پھسل جاتا ہے
کوئی دامن کہ جسے نازِ گل افشانی ہے
دھوپ میں سوکھتی خرما کی چنگیروں سے بھرے کوٹھوں سے
ایک پل کے لئے اُڑتا ہے سمٹتا ہے تو دھیرے دھیرے
کوئی لے سی مرے احساس میں بھر جاتی ہے
تارِ بربط کی کوئی لرزشِ پنہانی ہے

جو شب و روز کے ایواں میں فغاں بن کے بکھر جاتی ہے
آسمانوں سے زمینوں سے کسی دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
کوئی چپکے سے مرے کان میں کہہ جاتا ہے
سنتے ہو ' کس کی یہ آواز ہے ' پہچانی ہے؟

"یوں کب تک صبح و شام جئیں
بے سود جئیں، ناکام جئیں
جب دنیا والے سو جائیں
میٹھے سپنوں میں کھو جائیں
جب چلتے دریا تھم جائیں
تاروں کی نگاہیں جم جائیں
جب آنکھ لگے چوبداروں کی
جب آنکھ بچے رکھوالوں کی
دیوار و در سے چھپتے ہوئے
سائے کی طرح سمٹتے ہوئے
دو بھٹکی منزلوں سے بچیں ہم
جا نکلیں اک اور وطن میں ہم
کچھ دور، افق کے پار، ادھر
ہے ایک نیا سنسار، ادھر
خوشیوں کی سنگاروں کی دنیا
پھولوں کی بہاروں کی دنیا"

آج اس فرصتِ یک گام کو روتا ہوں جب اک لغزش پہ
چھین کر لے گئی مجھ سے وہ امنگوں سے چھلکتی دنیا

تو وہ دنیا تجھے خلوت میں بھی پا نہ سکا
یوں تو آفاق میں دنیاؤں کی ارزانی ہے

ان خلاؤں میں ستارے بھی ہیں خورشید بھی ہے ماہ بھی ہے
کون جانے کہ زمانے کے سمندر کی کوئی تھاہ بھی ہے
لیکن اک دنیا تجھے خلوت میں بھی پا نہ سکا
جس کے ہاتھوں میں مری چاک گریبانی ہے

میری ہم خواب تمناؤں کی نظروں سے گریزاں ہی رہی
لاکھ ڈھونڈا مگر اس کی نہ اک رنگ چشیوں تھی
بوجھ بن کر مری تقدیر کی پلکوں پہ رہا
اب مرا ذہن بھی اک شہرِ حیرانی ہے

اب یہ دنیا یہ صدا گوش نشینوں سے بھرے شہر و دیار
غموں خوشیوں کے جھمیلوں میں نہاتی ہوئی روحوں کا نکھار
مجھ سے پوچھو تو مرے واسطے اب یہ دنیا
ورقِ مصحفِ زندہ کی گراں جانی ہے

سوچتا ہوں یہی وہ خلوت جو ہیں نے کہ باراں سے بچے
یہی وہ شمعِ شبستان جو ہیں یہی وہ بجھتے دیے—
دوش و فردا کی فصیلوں میں یہی وہ رخنے
یہی جو سلسلۂ زندگی فانی ہے

کیا اسی ساعتِ محرومیِ غم تاب کی خاطر میں نے
وسعتِ وادیِ ایام میں کانٹوں سے قدم چوٹے تھے؟
لاکھوں دنیاؤں کے لٹتے ہوئے خوابوں سے
میرا حصہ بھی میری تہی دامنی ہے؟

کیا اسی واسطے ماضی کے تختوں سے اک موجِ حیات
اپنے ہمراہ لیے ناچتی گاتی ہوئی صدیوں کی برات
آ کے اس ساحلِ گل پوش سے ٹکرائی ہے؟
کیا یہی مقصدِ صد عالمِ امکانی ہے
کہ جب اس سطحِ خروشندہ پہ ڈھونڈوں میں کوئی رختِ طرب
کوئی نغمہ، کوئی نکتہ، کوئی تبسم، کوئی جینے کا سبب
آسمانوں سے صدا آئے "تو بے ذوقِ محبت ہے
تیرا ساماں تو یہی بے سروسامانی ہے"

عقل حیراں ہے، یہ طرفہ عجوبات حریمِ اسرار
عقدۂ راحت و غم، رازِ جہانِ گل و خار
پابہ زنجیر ارادوں کا خروشِ پیہم
یہی مستقبلِ معمورۂ انسانی ہے؟
کس کی فتراک میں ہیں عرشِ بریں فرشِ زمیں؟ کون ہے
پسِ صد پردۂ افلاک کوئی ہے کہ نہیں؟ کون ہے —

جب کسی گوشے سے دھندلی سی تصویر آتی ہے
[illegible] حقیقت کی حکایت [illegible] ہے
رستے زخموں سے چور [illegible] بے تاب کی پژمردہ جبیں —
کس نے جب [illegible] جلتے ہوئے دشت میں؟ معلوم نہیں
ہیں تو اپنے [illegible] امید کو بہلانے کو بھی
[illegible] کہتے ہے گلستاں میں بہار آتی ہے

جی میں آتی ہے کہ اک بار غمِ زیست پہ احسان کر کر
ریگ زاروں میں اُگتے ہوئے زہراب سے اک غم تر تر
(ریگ زاروں کے ابد رنگ جمود میں جس سے
خلوتِ دردوں کا ہنگامہ لافانی ہے)
ان زہراب سے غم بھرے ننھے ڈوبے اُفقِ دوراں پہ
آس کی آگ برسنے لگے اس پھولوں بھرے بستاں پہ

اب بھی [illegible] اس ظلمتِ بے پایاں کو
جو مری روح سے ایوان کی زندانی ہے

اُٹھ کے [illegible] اُٹھی اور مجھے [illegible] سے [illegible] پہ
کسی گمنام [illegible] جھونپڑے میں [illegible] چراغ [illegible]

اب راہ دیکھے گی کہاں ان بجھے ارمانوں کو
نئے سایوں میں مری زیست کی ویرانی ہے
کنول دوں جھوٹ جھونکوں سے چھپتے ہوئے چاندوں تک
سینۂ دشت پہ بجتی ہوئی شہنائیوں کی تانوں میں

سوچتا ہوں کہ یہ زندان سے جنگل کا سکوت
جس کی وسعت ہے کہ اک عالمِ حیرانی ہے
میری کھوئی ہوئی دنیاؤں کے کہرام سے گھبرا اٹھے —

اب یہ خالی ہے کہ ٹپکتی ہوئی بوندوں سے یہ جنگل جیسے
تھرتھراؤں کے بیچ جب سے کسی کی زد پہ
گہرے رستوں کی تھکی تھکی سی مری روئی ہے
یہ دھواں دھوپ آئی یہ شب ... پہاڑوں کی فصیلیں
دور تک چوٹیوں اور ... کی سرحدیں
برف کی چادریں جن سے لپٹ کر یہ دست
برف کی چوٹیوں کی ... پیشانی ہے
ہاں یہ سب سلسلۂ رنگ یہ نظارۂ حسن و افسوں —
میں اسے اپنی بھی جنت کی ان راتوں سے بھر...ں

جن کی ہر بن کبھی آنسو ہیں، کبھی آہیں ہیں
جن کی تقدیر کبھی آگ، کبھی پانی ہے

کوئی غایت، کوئی منزل، کوئی حاصل سفرِ ہستی کا —
کوئی مقصود بلندی کا کہ مفہوم کوئی پستی کا ؟ —
کوئی مشعل بھی نہیں کوئی کرن بھی تو نہیں
شب اندھیری ہے گھٹا ٹوپ ہے، طوفانی ہے
بولو اے نغمہ سرایانِ تحیّر کدۂ کاہکشاں
میں کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں ؟

نغمۂ کواکب

دائموس:

ناچ ناچ جھوم جھوم
گھوم گھوم گھوم گھوم

دیکھنا ادھر ضرور — اِک نظر
ناچتا ہے نزد و دور — بے خبر
دامنِ نگارِ نور — تھام کر
کہکشاں کے موڑ پر — فاصلوں کا اک ہجوم
ناچ ناچ — گھوم گھوم

وسعتِ ابد پناہ — اک ترنگ
عالمِ شبِ سیاہ — اک امنگ
منزلیں، نشانِ راہ — سحر رنگ
شعلہ شعلہ انگ انگ — آگ آگ روم روم
جھوم جھوم — گھوم گھوم

کورس

دیپ جلتے رہے دیے جلتے رہے
گھم گھم اندھے دھوئیں کے دَل
جگ جگ چھپ گئے کاجل
دم دم، دھم دھم، گرے محل
مٹی ہوئی صدیوں میں پل
ٹوٹتے رہے
دیے جلتے رہے،

کتنے زمانے، کتنے سپن
توڑ گئے اپنے درپن
نیر بہاتے رہے نین

وقت کے جھنجھن جھگن جھگن

جلتے رہے

دیے جلتے رہے!

اندھیاروں کے زہر پیے

آنکھوں کو گل رنگ کیے

امر اُجالے لو میں لیے

جیون کی منزل میں دیے

جلتے رہے

دیے جلتے رہے!

ارساؤس:

بھنور بھنور مری نوکا

کوئی ساحل ہے نہ کنارا

اک پھیلا بڑھتا دھارا

بہے نگر نگر مری نوکا، بھنور بھنور

ہر آن رُتوں کا میلہ

ہر سمت سے کا ریلا

چلے گھر گھر مری نوکا، بھنور بھنور

بوجھاتے ہیں کڑیل جن کے

یہ دکھ سکھ ' بیتے تکے

ریں ، اجڑ اجڑ مری ڈکا ' بھنور بھنور

بہتی ہوئی من کی بانی

تقدیر جہاں کی رانی

پھر سے سنور سنور مری ڈکا ' بھنور بھنور

پلوطو:

کتنی اندھیری رات ہے چیکو

چیکو

شام و سحر کی اوٹ سے بڑھ کر

چیم

گھور رہے ہیں طوفاں ہم کو

چیکو!

دیکھو ' تیریوں کے تختے '

کتنے

روند چلے عالم عالم کو

چیکو!

تھم میں سو لو اک پل کو
جگنو!
من میں بجھا لو شعلۂ غم کو
چمکو!

آتے ہوئے قرنوں کا تبسم
بھر کر
جگمگ دمکو، جھم جھم جھمکو
چمکو
کتنی اندھیری رات ہے چمکو
چمکو

کرۂ ارض

نہ کسی نے کہیں [illegible] جس ور کہیں
نہ کوئی وادی گلشن نہ شفق نور کہیں
کہیں سب راز میں فطرت کے مستور کہیں
نہ ہے شیشۂ افلاک چور چور کہیں
چاندنی کے چشمہ میں دھرے ابدی چمک کوئی
نظر کے سامنے حد نظر سے دور کہیں
ستاروں کے جہاں در جہاں تہہ دامن میں

بھٹک نہ جائے مرا شوقِ ناصبور کہیں
یہ اضطرابِ مسلسل کی حوں چکاں گھڑیاں
ہے ان سے بڑھ کے کوئی دولتِ سرور کہیں
اگر ہمیں بھری دنیا میں مسکرا نہ سکے
تو ڈول جائیں گے یہ سلسلے ضرور کہیں

شہر در شہر منادی ہے کہ "اے خندہ فروشانِ حیات!
ہر کبھی رُوح کے آنگن میں کھلا ہے چمنِ امکانات
نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب
زندگی ہی فقط آئینِ جہاں بانی ہے"
جانے کس تیرہ افق سے یہ گھٹاؤں کے تھرکتے سائے
ماہتابوں کے چمکتے ہوئے سینوں سے تھر کر آئے
ساتھ لے کر وہ خنک موج، خماریں جھونکے
جن کی زد میں مری تپتی ہوئی پیشانی ہے
اپنے سینے میں جگا کر انہی دردوں، انہی یادوں کے فسوں
پھر تمناؤں کے تصویر کدے میں نگراں بیٹھا ہوں
سامنے صفحۂ صد رنگِ رموزِ کونین
کانپتی انگلیوں میں موقلم مانی ہے!

(۲۰-۱۰-۱۹۵۴)

نرگس

میں نے حسرت بھری نظروں سے تجھے دیکھا ہے
جب تو روز اک نئے بہروپ میں روز اک نئے انداز کے ساتھ
اپنی ان گاتی ہوئی انکھڑیوں کی چشمکِ طناز کے ساتھ
روز اک تازہ صنم خانۂ آہنگ میں در آئی ہے!

ایکٹریس! روپ کی رانی! تجھے معلوم نہیں
کس طرح تیرے خیالوں کے بھنور میں جی کر
کن تمناؤں کا تلخابۂ نوشیں پی کر
میں نے اک عمر تِرے ناچتے سایوں کی پرستش کی ہے
تو نے اک عظمتِ صد رنگ سے جس جذبے کو
آج تک اپنے لیے عز و جزا رشک سمجھ رکھا ہے
وہ محبت مرے سینے میں تڑپتی ہوئی اک دنیا ہے
جو ترے قدموں کی ہر چاپ پہ چونک اٹھتی ہے

کاش میں بھی وہی اک عکسِ درخشاں ہوتا
دلِ انساں سے ابھرتی ہوئی موہوم تمناؤں کا عکس
ایک مانگی ہوئی اچکن میں سمایا ہوا اک مو پرفشاں شخص
جس کے پہلو میں تری روح بھڑک سکتی ہے

غزل

اک وہ کہ جن کی فکر ہے ارض و سما شکار
اک تو کہ ہے طلسمِ شب و روز کا شکار

لاؤ کہیں سے کوئی ضمیرِ فرشتہ صید'
ڈھونڈو کہیں سے کوئی نگاہِ خدا شکار

اس انجمن میں دیکھیے اہلِ وفا کے ظرف
کوئی ادا شناس ہے کوئی ادا شکار

آتا ہے خود ہی چوٹ پہ صیدِ سبک مراد
ہوتا ہے ورنہ کون ز کارِ قضا شکار

ظلِ ہما کی اوٹ میں چلّے پہ تیر رکھ
آساں نہیں نگاہ کے نخچیر کا شکار

جولاں گہِ حیات انہی کی ہے' دوستو
فتراک میں ہے جن کے دلِ مدعا شکار

غزل

نہیں سنتا کوئی مجھ کشتۂ آلام کے شکوے
کیے میں نے ہر اک ایواں کی چوکھٹ تھام کے شکوے

شفق کے رنگ آنکھوں میں، سحر کی اوس پلکوں پر
نہ آئے پھر بھی لب پر چرخِ نیلی فام کے شکوے

یہ کیسا دور ہے جس میں مجھے سننے پڑے ساقی
وہاں ہوش کے طعنے، شکستِ جام کے شکوے

اب ان بھولے ہوئے قصوں کو دہرانے سے کیا حاصل
یہ اب کیا آپ لے بیٹھے دلِ ناکام کے شکوے

تماشا ہے کہ جن کے واسطے گردش میں تھے عالم
انھیں بھی سوجھتے ہیں گردشِ ایام کے شکوے

غزل

چاندنی میں سایہ ہائے کاخ و کو میں گھومیے
پھر کسی کو چاہنے کی آرزو میں گھومیے

شاید اک بھولی تمنا، مٹتے مٹتے جی اُٹھے
اور ابھی اس جلوہ زار رنگ و بو میں گھومیے

روح کے در بستہ سناٹوں کو لے کر اپنے ساتھ
ہمہماتی محفلوں کی ہاؤ ہو میں گھومیے

کیا خبر، کس موڑ پر مہجور یادیں آملیں
گھومتی راہوں پہ، گردِ آرزو میں گھومیے

زندگی کی راحتیں ملتی نہیں، ملتی نہیں
زندگی کا زہر پی کر جستجو میں گھومیے

کنجِ دوراں کو نئے اک زاویے سے دیکھیے
جن خلاؤں میں نرالے چاند گھومیں گھومیے

بھکارن

تیز قدموں کی آہٹوں سے بھری
رہگذر کے وہ رویہ سبزہ و کشت
چار سو جنتی رنگوں کے بہشت

صد خیابانِ گل، کہ جن کی طرف
دیکھتا ہی نہیں کوئی راہی!
سُرخ پھولوں سے اک لدی ٹہنی
آن کر بجھ گئی ہے رستے پر
کنکروں پر جبیں رگڑتی ہے
راہگیروں کے پاؤں پڑتی ہے

"میں کہاں روز روز آتی ہوں
ہے مرے کوچ کی گھڑی نزدیک،
جانے والو، بس اک نگاہ کی بھیک"

موجودگی

پھر آج دل میں کوئی موجِ غم مچلتی ہے
شبِ خیال میں قندیل لَو جلتی ہے
پھر اک ادائے حجاب
رسوم دہر کی زنجیر اُتار آئی ہے
بہار آئی ہے

رسوم دہر کی اس آتشیں فصیل کے پار
گداز سینوں کی مخمور دھڑکنوں کے دیار
محبتوں کے سراب
کہ جن کو تیر کے آتی ہے پائلوں کی جھنک
مرے دکھے دل تک!

ہر اک طرف ہوسِ دید کے نیستاں میں
کسی حسین سی موجودگی کی خوشبو میں
خمارِ قرب کے خواب
ہزار غم کہ جنھیں کیفِ شوق کی نیندیں
پیامِ تسکیں دیں

(۳-۱۹۵۷)

کہانی ایک ملک کی

راج محل کے دروازے پر
آ کے رکی اک کار
پہلے نکلا بھدا، بے ڈھب، بودا
میل کچیل کا تودا
حقہ تھامے اک میراثی
عمر اس کی کوئی اسی بیاسی
پیچھے اس کا نائب، تمباکو بردار
باہر نکلے اس کے بعد قطار قطار
عنبر بار
نمبردار
ساتھ سب ان کے دم چھلے
ایم ایل اے

راج محل کے اندر اک اک رتنا سن پہ
کوڑھی جسم اور نوری جامے
روگی ذہن اور گُردوں پیچ تھامے
جبل بھرے علامے
ماتھے گاۓ
بیٹھے ہیں اپنی مٹھی میں تھامے
ہم مظلوموں کی تقدیروں کے ہنگامے
جیبھ پہ شبد — اور جیب میں چاقو
نسل بلا کو!

راج محل کے باہر، سوچ میں ڈوبے شہر اور گاؤں
مِل کی اَنی فولاد کے پنجے
گھومتے پہیے، کڑیل باہیں
کتنے لوگ کہ جن کی روحوں کو سندیسے بھیجیں
سُکھ کی سیجیں
لیکن جو ہر راحت کو ٹھکرائیں
آگ جئیں اور پھول کھلائیں

دیکھ اے دِل!

دیکھ اے دل کیا سماں ہے کیا بہاریں شام ہے
وقت کی جھولی میں جتنے پھول ہیں انمول ہیں
نہر کی پٹڑی کے دو رویہ مسلسل دور تک
برگدوں پر پنچھیوں کے غل مچاتے غول ہیں

دیکھ اے دل کتنے ارمانوں کا رس برسا گئیں
بدلیاں جب ان پہ چھینٹے نور کے چھن کر پڑے
کتنی کومل کامناؤں کی کہانی کہہ گئے
پیپلوں کے پیلے پیلے پات پتھ پتھ پر پڑے

دیکھ اے دل اس رسیلی رت کے کتنے روپ ہیں
جھومتے جھونکے ہیں جھکتی جھاڑیوں کے جھنڈ ہیں
ہائے ان پھیلی ہوئی پھلواڑیوں کے درمیاں
یہ تری تپتی ہوئی تنہائیاں اور ایک میں

غزل

جھونکوں میں رس گھولے دل
پون چلے اور ڈولے دل

جیون کی رُت کے سَو روپ
نغمے، پھول، جھکولے، دل

تاروں کی جب جوت جگے
اپنے خزانے کھولے دل

یادوں کی جب پینگ چڑھے
بول البیلے بولے دل

کس کی دھن ہے باورے من؟
تیرا کون ہے؟ بھولے دل

غزل

وہ شے جو ایک نئے دور کی بشارت ہے
ترے لہو کی تڑپتی ہوئی حرارت ہے

نظامِ کہنہ کے سائے میں عافیت سے نہ بیٹھ
نظامِ کہنہ تو گرتی ہوئی عمارت ہے

وطن چمکتے ہوئے کنکروں کا نام نہیں
یہ تیرے جسم تری روح سے عبارت ہے

یہ کہہ رہی ہے صدا ٹوٹتے سلاسل کی
کہ زندگی تو فقط اک حسیں جسارت ہے

یہ اک جھلک ہے بدلتے ہوئے زمانوں کی
جبیں جبیں پہ شکن بھی کوئی بجھارت ہے

چمن میں اہلِ چمن کے یہ طور، ارے توبہ
کلی کلی کی ہنسی خندۂ حقارت ہے

دلوں کی جھونپڑیوں میں بھی روشنی اترے
جو یوں نہیں تو یہ سب سیلِ نور اکارت ہے

غزل

دن کٹ رہے ہیں کشمکشِ روزگار میں
دم گھٹ رہا ہے سایۂ ابرِ بہار میں

آتی ہے اپنے جسم کے جلنے کی بو مجھے
لٹتے ہیں نکہتوں کے سبو جب بہار میں

گزرا اِدھر سے جب کوئی جھونکا تو چونک کر
دل نے کہا یہ آ گئے ہم کس دیار میں'

اے کنجِ عافیت تجھے پا کر پتہ چلا
کیا ہمہمے تھے گردِ سرِ رہگزار میں

میں ایک پل کے رنجِ فراواں میں کھو گیا
مرجھا گئے زمانے مرے انتظار میں

غزل

اُمیدِ دیدِ دوست کی دُنیا بسا کے ہم
بیٹھے ہیں مہر و ماہ کی شمعیں بُجھا کے ہم

وہ راستے خبر نہیں کس سمت کھو گئے
نکلے تھے جن پہ رختِ غمِ دل اٹھا کے ہم

پلکوں سے جن کو چلتے زمانوں نے چُن لیا
وہ پھول، اس روش پہ، ترے نقشِ پا کے ہم

آئے کبھی تو پھر وہی صبحِ طرب کہ جب
روٹھے ہوئے غموں سے ملیں مسکرا کے ہم

کس کو خبر کہ ڈوبتے لمحوں سے کس طرح
اُبھرے ہیں یادِ یار، تری چوٹ کھا کے ہم

غزل

قریبِ دل، خروشِ صد جہاں ہم
جو تم سن لو، تمھاری داستاں ہم

کسی کو چاہنے کی چاہ میں گُم
جیے بن کر نگاہِ تشنگاں ہم

ہر اک ٹھوکر کی زد میں لاکھ منزل
ہمیں ڈھونڈھو، نصیبِ گمرہاں ہم

ہمیں سمجھو، نگاہِ ناز والو!
لبوں پر کانپتا حرفِ بیاں ہم

بجھی شمعوں کی اس نگری میں، امجد
اُبھرتے آفتابوں کی کماں ہم

آورد

دھیان کا جب بھی کوئی پٹ کھولا
"میری بات نہ کہہ۔۔۔" دل بولا
دل کی بات کہی بھی نہ جائے
ضبط کی میں سہی بھی نہ جائے
نظم میں کس کا ذکر کروں اب
فکر میں ہوں کیا فکر کروں اب
ایک عجب الجھن میں گھرا ہوں
کیا سوچوں، یہ سوچ رہا ہوں

میں نے بہت کم شاعر ایسے دیکھے ہیں جن کے یہاں زندگی کی ہولناک سنجیدگی اور مقدر کی ستم آرائی کے ایسے دردناک تصورات موجود ہوں اس کے باوجود اس کے قاری کا مجموعی تاثر انبساط میں اتنا ڈوب کر باہر آتا اور مطمئن ہوتا ہو جتنا امجد کے کلام سے ہوتا ہے۔ امجد زندگی کو دکھ بھرا دن کہتا ہے مگر اس کے کلام میں رس رچا ہوا ہے کہ اس کی تاثیر حقی ہو جاتی ہے۔

(ڈاکٹر سید عبداللہ)

مجید امجد نے جس آفاقی شعور کا مظاہرہ کیا ہے وہ اقبال کے بعد مجید امجد ہی کی نظم میں پوری طرح اُجاگر ہوا ہے اس فرق کے ساتھ کہ اقبال کا رویہ فلسفیانہ ہے جبکہ مجید امجد نے سائنسی سوچ سے استفادہ کیا ہے۔

(ڈاکٹر وزیر آغا)

مجید امجد ہمارے دور کے بڑے شاعر بھی ہیں اور اہم بھی۔ بڑے شاعر غالب، مصحفی اور اقبال کے معنوں میں۔ اہم یوں کہ ان کے مطالعے کے بغیر ہمارے شاعرانہ ذوق اور فنی ارتقاع کی تربیت نامکمل رہے گی۔

(سید جعفر طاہر)

میراجی، فیض اور راشد نے اپنے مکاتب فکر کو جنم دیا ہے۔ اس عہد کے بیشتر لکھنے والے ان تینوں میں سے کسی نہ کسی کے پیچھے لمبی قطاروں میں کھڑے ہیں مگر مجید امجد نے نہ کسی کی تقلید کی ہے اور نہ کسی کو اپنی تقلید کی ترغیب دی ہے۔ مجید امجد ابھی تک بہت نیا ہے جبکہ میراجی، فیض، اور راشد پرانے ہو چکے ہیں۔

(شہزاد احمد)

نئی نظم اور آزاد نظم کے سلسلے میں کچھ سکہ بند نام بار بار دہرائے جاتے ہیں لیکن میرے نزدیک ان سب سے زیادہ اہم اور دور رس اثرات کا حامل کام مجید امجد نے کیا ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات، تکنیک، نظم کی فکری اور فنی ترتیب، نئے اسالیب کی طرف بے جھجک پیش قدمی اور سب سے بڑھ کر زندگی بھر ایک نئے لہجے کی تلاش کا عمل وہ بنیادیں ہیں جن پر مستقبل کی شاعری کو اپنے کاخ و کو بلند کرنے ہیں۔

(امجد اسلام امجد)